Regd. L. No.7243 Phone 880600

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

اکتوبر 1984

اس پرچہ میں

## صلوٰۃ

(قرآن کے آئینے میں)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

| قیمت فی پرچہ | ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ | بدل اشتراک |
| --- | --- | --- |
| ۴ | خط و کتابت | سالانہ |
| چار روپے | ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور | پاکستان /۴۸ روپے<br>غیر ممالک /۹۸ روپے |
| شمارہ ۱۰ | اکتوبر ۱۹۸۴ء | جلد ۳۷ |


## فہرست

۱۔ لمعات۔ (اسلامی مملکت کی بعض خصوصیات) ——— ۲

۲۔ قرآن کا معاشی نظام (ایک جامع مقالہ) پرویز صاحب ۱۰

۳۔ باب المراسلات ——— ۳۷

(۱) طلاق (۲) عورت کی دیت (۳) اجارہ و رہبان

(۴) احکام پر عمل کیوں نہیں ہوتا (۵) (کالعدم) جماعت اسلامی کی سیاست

(۶) ایک قانونی نقطہ کی وضاحت

۴۔ الصلوٰۃ (قرآن کے آئینے میں) ——— ۴۹

بصیرت افروز مقالہ (پرویز صاحب)


ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

# لمعات

## (اسلامی مملکت کے متعلق مزید وضاحتیں)

ذیل کا استفسار غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ یہ خود ہمارے، آپ کے، سب کے دل کا ترجمان ہے:۔

جب سے انتخابات کی سرسراہٹ ہوئی ہے ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ لیڈروں کی تقاریر اور بیانات پر تو پابندی ہے لیکن اخبارات میں اسلامی سیاست کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مضامین بکثرت شائع ہونے لگے ہیں۔ ان پر ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی تقاریر مستزاد ہیں۔ اب یہ سلسلہ سیریز کی شکل اختیار کرنے لگ گیا ہے۔ ان کے موضوع بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ "اسلامی نظامِ سیاست" ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ حال ہی میں جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ "مغربی جمہوریت اور اسلامی نظامِ مشاورت" سے متعلق ہے۔ تحریریں ہوں یا تقریریں، ان میں ایک قدرِ مشترک نمایاں ہے۔ یعنی ان سب کا انداز "پیازی" ہوتا ہے۔ چھلکے پہ چھلکا اتارتے جائیے۔ نیچے سے کچھ نہیں نکلے گا۔ پرشکوہ الفاظ، نادر تراکیب، نامانوس اصطلاحات، اندازِ خطیبانہ، آواز غلغلہ انگیز، یہ سب کچھ لیکن متعین بات کوئی نہیں۔ سامعین اور قارئین کو ادھر لٹکا ہوا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ انداز قصداً اختیار کیا جا رہا ہے کہ عوام کے ذوقِ اسلامیت کی تسکین بھی ہو جائے اور وہ کسی خاص نتیجہ پر پہنچنے بھی نہ پائیں۔ تاکہ کل کو یہ نہ کہہ سکیں کہ جو کچھ کیا گیا ہے، وہ نہیں جو ہمیں اسلامی کہکر بتایا گیا تھا۔

ایسا دانستہ کیا جا رہا ہے یا نادانستہ، اس سے ذہنوں میں بڑی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، اور اسلام کے متعلق عجیب و غریب قسم کے شکوک و شبہات ابھر رہے ہیں۔ حالیہ موضوع۔ مغربی جمہوریت اور اسلامی مشاورت کے تقابل سے متعلق چند ایک سوالات پیشِ خدمت ہیں۔ اسلام کی روشنی میں ان کا متعین جواب، بہت سے اذہان کے لئے وجہ اطمینان اور بہت سے

قلوب کے لئے باعثِ سکون ہوگا۔

**طلوعِ اسلام** جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، یہ کیفیت، ہزاروں لاکھوں سوچنے والے ذہنوں کی ترجمان، اور حساس قلوب کی دھڑکنوں کی غماز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سیاسی مقاصد کے لئے اس قسم کی غیر متعین کیفیت دانستہ پیدا کی جارہی ہو، لیکن اگر یہ کچھ نادانستہ ہو رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ اور ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ غیر اسلامی۔ نظامِ حکومت غیر اسلامی۔ احکام و قوانین غیر اسلامی۔ ہماری ذہنیت غیر اسلامی۔ سوچ غیر اسلامی۔ اس غیر اسلامی ہجوم میں، متعلقہ مسائل پر، اسلامی نقطۂ نگاہ سے گفتگو شروع کر دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ فضا میں یہ فِٹ بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ (انگریزی محاورہ کے مطابق) یہ "چوکور سوراخ میں گول فٹ کرنے" کی سعی ناکام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص جھٹکے سے گوشت کو فی سبیل اللہ تقسیم کر کے ثواب حاصل کرنا چاہے۔ ملک میں نظامِ سرمایہ داری قائم رکھتے ہوئے سود ختم کرنے کی ناکام تدابیر اس کی زندہ مثال ہے۔ جب اس قسم کی تدبیریں ناکام رہ جاتی ہیں تو، غیر مسلموں کے دل میں تو بعد میں، خود اپنے ہاں کی نوجوان نسل کے دلوں میں سب سے پہلے یہ خیال ابھر آتا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں۔ یہ اسلام کا اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی صدیوں میں جاکر بھی نہیں ہوسکے گی۔ اس وقت ملک میں اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف جو اسقدر تلاطم انگیز سیلاب امنڈ رہا ہے، معلوم نہیں یہ کہاں جاکر تھمے گا، اور اس دوران میں کتنی بستیاں ویران کر جائے گا۔

اب آئیے ان کے سوالوں کی طرف۔

سوال ۱:۔ مغربی جمہوریت اور اسلامی نظامِ مشاورت میں کیا فرق ہے؟

جواب:۔ اس فرق کو سمجھنے سے پہلے، اس بنیاد کو سمجھ لیجئے جس پر اسلام کے نظامِ سیاست کی فلک بوس عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ بنیاد ہے، تکریمِ انسانیت۔ قرآنی تصورِ حیات کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ جس نظام میں انسان کا شرف اور اس کی تکریم قائم رہتی اور پروان چڑھتی ہے، وہ اسلامی ہے۔ جس میں اس کی تذلیل ہوتی ہے، وہ غیر اسلامی۔ جب ایک انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم یا محتاج ہو، تو وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، اسلام کے سیاسی نظام کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوتا۔ سر دست، ہم اپنے آپ کو محکومیت تک محدود رکھتے ہیں۔ محتاجی الگ موضوع ہے جس کا تعلق

معاشی نظام سے ہے۔ اس کے لئے قرآن نے کہا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ حق حکومت سے عملاً مراد، قانون سازی کا حق اور اختیار ہوتا ہے۔ یہ حق خدا نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور اپنے قوانین کو اس نے اپنی کتاب میں مکمل غیر متبدل اور محفوظ شکل میں، انسانوں کو دے دیا ہے۔ ان قوانین میں وہ احکام کی شکل میں ہوں یا قوانین کی صورت میں۔ اصولوں کے رنگ میں ہوں یا اقدار کے انداز میں۔ حدود کے پیرایہ میں ہوں یا قیود کے خطوط میں کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اختیار ہے، نہ حک و اضافہ کا حق حاصل۔

مغرب کے جمہوری نظام کی بنیاد اس مسلّمہ پر ہے کہ قوم کے نمائندوں کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون وضع کر دیں۔ ان کے اس حق یا اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ اسلامی مجلس مشاورت بھی قوم کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اسے، قانون سازی تو ایک طرف، قوانین خداوندی (قرآنی قوانین) میں کسی قسم کے رد و بدل کا بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا فریضہ یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ ان قوانین (خداوندی) کو نافذ کس طریق سے کیا جائے کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ ان تجاویز و تدابیر کو آپ طریق کار کہہ لیجئے۔ بائی لاز کہیئے۔ قواعد و ضوابط کہہ لیجئے۔ یہ سب، ابدی قوانینِ خداوندی (قرآنی احکام) کے نفاذ کے طریق ہوں گے۔ اسلامی مجلس مشاورت کا اتنا ہی اختیار ہوگا۔ اور بس۔

ہمارے ہاں جب مغربی جمہوریت اور اسلامی مشاورت کے تقابل کی بات چھڑتی ہے تو بحث اس پہ ہوتی ہے کہ مغربی جمہوریت میں نمائندگان کا انتخاب اس طریق سے ہوتا ہے۔ اسلامی مشاورت میں اس طریق سے ہوگا۔ وہاں نمائندگی کی شرائط یہ ہوتی ہیں، اسلامی مشاورت میں یہ ہونگی۔ وقس علیٰ ذالک۔

یہ تقابل ہی غلط ہے۔ سوال طریق کار کا نہیں۔ امت مسلمہ، باہمی مشاورت کے لئے جو طریق بھی مناسب سمجھے اختیار کر سکتی ہے۔ اس سے یہ اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہو جاتی۔

اقبال آں قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد — دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

اصل فرق، قانون سازی کا اختیار ہونے یا نہ ہونے کا ہے۔ طریق کار کوئی بھی ہو۔ مختصر الفاظ میں مغربی جمہوریت، ناتھ بے زمام (UN-CONTROLLED) ہوتی ہے۔ اسلامی مشاورت حدود خداوندی کی پابند۔ اسلامی معاشرہ میں، امت اور خود مجلس مشاورت کے اراکین قوانین خداوندی کے پابند ہوتے ہیں کسی انسان کے وضع کردہ قوانین کے تابع نہیں ہوتے کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت تو ایک طرف قرآن، تو انسان کو خود

اس کے اپنے قوانین (خواہشات، مفاد و مقاصد) کی حکومت کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ وہ ایسے بھی اسی طرح شرک قرار دیتا ہے جسطرح کسی دوسرے انسان کے قوانین کی اطاعت کو۔ ارشادِ خداوندی ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ (۴۵/۲۳)۔ "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود (حکمران) بنا لیتا ہے اور یوں علم و عقل کے باوجود گمراہ کا گمراہ رہتا ہے!" جو قرآن، قوانین خداوندی کے خلاف انسان کے اپنے فیصلوں کی اطاعت کو بھی شرک قرار دیتا ہو، وہ دوسرے انسانوں کے فیصلوں کی اطاعت کو کس طرح اسلامی قرار دے سکتا ہے۔ خواہ وہ فیصلہ کسی بادشاہ کا ہو، ڈکٹیٹر کا ہو، یا انسانوں کے گروہ (جمہوریت) کا۔ وہ خواہ دورِ حاضرہ کے قانون ساز ہوں اور خواہ زمانہ سابقہ کے۔ یہ سب اصنام، (معبودانِ باطل) ہیں۔

(۲) سوال:۔ اس مجلس کی نمائندگی کے لئے کسی قسم کی شرائط بھی عائد کی جا سکیں گی؟

جواب:۔ قرآن کریم نے مملکت، حکومت یا نظام کسی فرد یا گروہ کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ وہ ساری کی ساری امت کا ہوتا ہے۔ امت اس کے نظم و نسق کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرتی ہے، وہ جسے مناسب سمجھے اپنا نمائندہ منتخب کرے۔ کسی اور کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو اپنی عائد کردہ شرائط کے مطابق الگ کرلے اور پھر قوم سے کہے کہ وہ اس گروہ میں سے اپنا نمائندہ منتخب کرے۔ اس قسم کا نمائندہ، قوم کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں! قرآن نے جسے ساقط الاعتبار قرار دیا ہو، اسے منتخب نہیں کیا جائے گا۔ (مثلاً) وہ جس کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ (۲۴/۴)

کہا جائے گا کہ اسطرح تو خراب نمائندے منتخب ہو کر آ جائیں گے؟ تو پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ (قرآن کی رُو سے) کہا جا رہا ہے، وہ اسلامی امت کے لئے ہے جو خراب نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے منتخب نمائندے بھی خراب نہیں ہوتے۔

اگر کسی کے ذہن میں موجودہ امت (یعنی ہم خود) ہیں، تو جسطرح کی امت ہوگی اسی قسم کے اس کے نمائندے ہوں گے۔ غیر اسلامی امت کے نمائندے اسلامی کسطرح ہونگے؟ جو خرابیاں بہ حیثیت مجموعی امت میں ہوں گی، وہی خرابیاں (انفرادی طور پر) اس کے نمائندوں میں بھی ہوں گی۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، غیر اسلامی امت، غیر اسلامی معاشرہ، غیر اسلامی نظام میں سے اسلامی مجلسِ مشاورت متشکل ہو نہیں سکتی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ قرآن کریم غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں شریک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ ان پر ایمان لانے کی شرط عائد کرتا ہے۔ لیکن وہ اسی قسم کی شرط ہما رے جیسے مسلمانوں پر بھی عائد کرتا ہے۔ وہ ہم سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ... الخ (۴/۱۳۶)
اے وہ جو مسلمان کہلاتے ہو۔ جو صاحب ایمان ہونے کے مدعی ہو۔ تم بھی ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس رسول پر نازل کی گئی تھی .... سو جب تک موجودہ مسلمان اسطرح ایمان نہ لائے وہ امّت مسلمہ کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔ قرآن پر ایمان لانے سے مراد یہ ہوگا کہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا عملی ضابطہ قرار دے۔ سوچئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو اس طرح ایمان لائے ہیں! ہم مسلمان قوم کے افراد ہیں۔ ( یا ایھا الذین امنوا) کے زمرہ میں داخل نہیں ہیں۔ سو جب تک ہم اس زمرہ میں داخل نہیں ہو جاتے۔ جب تک یہ امّت امتِ مسلمہ نہیں بن جاتی، ہمیں اپنے معاملات قومی سطح پر حل کرنے چاہئیں۔ اسلامی حدود و شرائط کی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اسلامی حدود و شرائط اسلامی امّت کے لئے ہوتے ہیں۔

(۳) سوال:۔ جب صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت کا ذکر ہوتا ہے تو اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی ہستیوں کا نام آتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی مملکت انہی جیسی شخصیتوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتی ہے۔ کیا آج ان جیسی شخصیتوں کا پیدا ہونا ممکن ہے؟

جواب:۔ صدرِ اوّل میں، نبیؐ کو تو الگ چھوڑ دیجئے کہ نبوّت کا معاملہ بشریت سے جداگانہ تھا۔ نبیؐ کے سوا جتنے حضرات بھی تھے، وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اسی قوم کے افراد تھے جن میں دنیا بھر کے عیوب و ذمائم تھے۔ وہ اسی قسم کے خصائص کے ساتھ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے قوانینِ خداوندی کی پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کر لیا اور اس طرح ان میں وہ تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی جس سے وہ صدیق اکبرؓ اور فاروقؓ اعظم بن گئے۔ آج وہی قوانینِ خداوندی (قرآن میں) محفوظ ہیں اور اس قابل کہ وہی نتائج پیدا کریں جو انہوں نے اس زمانے میں پیدا کئے تھے۔ اس لئے اگر، ہم بھی ان قوانین کی پابندی اختیار کر لیں، تو ہم بھی انہی خصوصیات کے حامل ہو سکتے ہیں، ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ ہم (موجودہ) دورِ جاہلیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے ہاں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تلاش کرتے ہیں۔ اور جب وہ نہیں ملتے تو اسلام سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ:

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ‏ ‏ اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

امت کی اس مایوسی میں ان لوگوں کا بھی بیشتر دخل ہوتا ہے جن کے سینے میں ہوسِ انا ربکم الاعلیٰ بننے کی مچلتی ہے لیکن ہاتھ میں عصاءِ کلیمی کے مدعی ہوتے ہیں۔ عوام سمجھتے ہیں کہ اس دور میں اسی قسم کے مشاہیر پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدیقؓ و فاروقؓ پیدا نہیں ہو سکتے۔

(۴) سوال :۔ کیا اسلامی مجلس مشاورت میں اختلافات بھی ہوں گے ؟
جواب :۔ اس مجلس کے اراکین غور و فکر کریں گے کہ فلاں حکمِ قرآنی کو نافذ کرنے کیلئے احسن طریقِ کار کیا ہوگا۔ ان کی اس سوچ میں اختلاف بھی ہوگا۔ مختلف آراء زیرِ بحث آئیں گی اور منطقی عمل تخریج (PROCESS OF ELIMINATION) سے احسن طریق متعین ہو جائے گا۔ چونکہ اس میں کسی کی انا کا سوال نہیں ہوگا (اہلِ جنت کے دلوں میں غِلّ نہیں ہوگا۔ ۴۷/۱۵، ۵۹/۱۰) اس لئے وہ طریق کسی کی رائے کے خلاف بھی ہوگا تو وہ اسے بطیبِ خاطر قبول کر لے گا۔ یعنی اختلافات حل ہو کر اتفاق کی شکل اختیار کر لیں گے۔ جب غلط اور صحیح کے پرکھنے کی کسوٹی (قرآن) موجود ہو تو اختلافات مٹ جاتے ہیں۔

(۵) سوال :۔ کیا اس میں حزبِ مخالف بھی ہوگا ؟
جواب :۔ مغربی جمہوریت میں حکومت کسی ایک پارٹی کی ہوتی ہے۔ دوسری پارٹی کی مسلسل کوشش ہوتی ہے کہ اس پارٹی کی حکومت کو ناکام بنا دے تاکہ اس کی جگہ ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ اسے حزبِ مخالف کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں حکومت (یعنی قوانینِ خداوندی نافذ کرنے کی ذمہ داری) ساری امت کی ہوتی ہے اس لئے اس میں پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابل حزبِ مخالف، امتِ کفریہ ہوتی ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین کے بالمقابل ساری دنیا کے غیر مسلم۔ ابوجہل۔ مجلسِ محمدیہ کے باہر، حزبِ اختلاف کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس مجلس کے اندر ابوجہل کا کیا کام ؟ قرآن کی رُو سے احزاب (پارٹیاں) دو ہی ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان (۵۸/۱۹-۲۲) حزب اللہ (جماعتِ مومنین امتِ مسلمہ) کے اندر پارٹیاں بنانے کے مدعیوں سے پوچھئے کہ حزب اللہ کے اندر کوئی حزب ہوگی تو اس کا نام کیا ہوگا ؟ وہ بہرحال حزب اللہ سے الگ کوئی حزب ہوگی کیونکہ حزب اللہ (صیغہ واحد) تو ایک ہی ہوگی۔ ایک سے زیادہ کے لئے حزب اللہ کی اصطلاح ہی غلط ہوگی۔ وہ احزاب ہوں گی۔

(۶) سوال :۔ مشورہ کے بعد فیصلہ کون کرے گا ۔
جواب :۔ اس کا جواب قرآن کریم نے بطریقِ احسن دیا ہے۔ مشورہ کا حکم دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸)۔ "معاملات میں تم ان سے مشورہ کیا کرو"۔ چونکہ حضورؐ صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے اس لئے (ظاہر ہے کہ) آخری فیصلہ بھی حضورؐ ہی کے لئے تھا۔ خود آیت میں اس کے بعد ہے: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ پھر جب تو ارادہ (فیصلہ) کرے تو قوانینِ

خداوندی کی ملکیت پر بھروسہ کر کے اس کے مطابق عمل پیرا ہو جائے"۔ عزمت حضورؐ ہی کے لیے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا انداز یہ بھی ہے کہ مخاطب رسول اللہؐ ہوتے ہیں اور مراد جماعت مومنین ہوتی ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں فیصلہ آپ ہی پر چھوڑا گیا ہے۔ آپؐ سربراہ مملکت ہی نہیں تھے۔ رسول بھی تھے۔ اس سے ضمناً ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عقیدہ یہ بھی ہے کہ وحی قرآن ہی نہیں۔ حضورؐ کا ہر ارشاد و عمل بھی وحی پر مبنی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضورؐ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہوتا تھا تو آپؐ کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کا حکم کیوں دیا گیا۔ جو فیصلہ وحی پر مبنی ہو اس کے لیے مشورہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ بات یہ تھی کہ حضورؐ کو جس انداز سے مشورہ کا حکم دیا گیا تھا نظر آتا ہے کہ اس میں فیصلہ حضورؐ ہی پر چھوڑا گیا تھا۔

حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق فرمایا وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42/38) "ان کے امورِ مملکت ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔" یہاں (رسول اللہؐ کی طرح) کسی کو باقیوں سے مشورہ کرنے کے لیے نہیں کہا گیا۔ کہا یہ گیا ہے کہ "ان کے معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔" اس میں امیر یا سربراہ کی حیثیت دوسروں سے ممتاز نہیں۔ مشاورت میں وہ بھی دوسروں کے ساتھ شامل ہوگا۔ یوں کہیے کہ وہ بھی مجلس مشاورت کا ایک رکن ہوگا اور اسی حیثیت سے مشورہ دے گا۔ یہ بات اس مجلس پر موقوف ہے کہ وہ طے کرے کہ فیصلہ کس طرح سے ہوگا۔ اس فیصلہ کا نفاذ البتہ امیر (سربراہ مملکت) کی طرف سے ہوگا۔ (اسے طلوعِ اسلام میں مرکزِ ملت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی امت کی مرکزی اتھارٹی)۔ اس قسم کی اتھارٹی کا وجود آئینی تقاضا ہوتا ہے۔ اس نظام میں سربراہ مملکت کی حیثیت بھی بس اتنی ہوتی ہے۔ منشاءِ خداوندی یہ تھا کہ اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی جاری رکھا جائے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ "محمد بجز اس کے کہ خدا کا ایک پیامبر ہے۔" قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ "اس قسم کے رسول اس سے پہلے بھی آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے دنیا سے چلے گئے"۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ "اگر کل کو یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم یہ کہہ کر کہ نظامِ خداوندی تو آپؐ کی زندگی تک تھا۔ آپؐ کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو گیا، پھر اپنے نظامِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ...... (3/144)۔ جو ایسا کرے گا وہ کچھ اپنا ہی بگاڑے گا۔ خدا کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

یہ نظام اس طرح آگے چلنے کے قابل اسی لیے تھا کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر تھی جو

اپنی مکمل غیر متبدل شکل میں محفوظ تھا۔ اس کے ساتھ ایک امت موجود تھی جس نے باہمی مشاورت سے اس نظام کو قائم رکھنا تھا۔ حضورؐ کے کچھ عرصہ بعد تک یہ قائم رہا لیکن اس کے بعد (قرآن نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا) امت نے وہی کیا۔ وہ قرآن کو چھوڑ کر ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی طرف پلٹ گئی۔ اس کے بعد امت پر جس قدر تباہیاں اور بربادیاں آئیں اس کی یہی وجہ تھی (اور یہی وجہ ہے)۔ اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے یہ سمجھنا کہ ہم اسلامی زندگی بسر کر سکتے ہیں، انتہائی خود فریبی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظامِ زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸) ارشادِ خداوندی ہے۔ اسکے منتہیٰ تک بیشک بتدریج پہنچا جائے گا لیکن باطل کے ساتھ مفاہمت کسی مقام پر بھی نہیں کی جائے گی۔ ہر قدم پر فیصلہ قرآنِ خالص کے مطابق ہوگا۔ چونکہ اس میں حکومت مجلس شوریٰ کی بھی نہیں ہوگی اسلئے اسے "شوریٰ کریسی" (شوریٰ کی حکومت) کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ یہ ہیں مستفسر کے سوالات کے جوابات۔ آخر میں ایک ضروری تنبیہ (وارننگ)!

اسلامی حکومت اور اس کے لوازمات اور خصوصیات کے متعلق جو کچھ ہم قرآن کریم کی رُو سے کہتے ہیں اس کا اطلاق قرآنی حکومت پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں کہیں بھی قرآنی حکومت نہیں۔ اس لئے ان کا عملی اطلاق اسر دست کہیں بھی نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انکی حیثیت صرف نشاناتِ راہ کی سی ہے۔ یعنی وہ یہ بتائیں گے کہ اگر کسی نے قرآنی حکومت قائم کرنے کو اپنی منزل قرار دینا ہو تو اسے اس راستے سے جانا ہوگا۔ ہم ان نشانات کو اس لئے نصب کر رہے ہیں کہ ہماری ملوکیت زدہ تاریخ نے انہیں یکسر مٹا دیا ہے۔ اور ان کی جگہ مزاروں کے کتبوں نے لے رکھی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جس طرح ہم اپنی سابقہ تاریخ کو اسلام کی تاریخ کہہ کر پکارتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں کو اسلامی مملکتیں اور ان کی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں کہتے ہیں۔ اسلام کے متعلق جملہ غلط فہمیاں "اسلام" اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مفاد پرست گروہوں کی مصلحت اسی میں ہوتی ہے کہ یہ فرق نمایاں نہ ہونے پائے۔ ان کی یہی مصلحت اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے

مذہب پرست (دین فراموش) قوم بڑی آسانی سے اس دھوکے میں آجاتی ہے اور مذہبی پیشوائیت اس پردے کو دبیز سے دبیز تر کرتی رہتی ہے۔ یاد رکھئے! نہ وہ امت امتِ مسلمہ ہو سکتی ہے جس میں فرقے ہوں۔ نہ وہ حکومت اسلامی حکومت جس کے فیصلے قرآن کے مطابق نہ ہوں۔

# قرآن کا معاشی نظام

**اس کا مطالعہ گہری توجہ کا متقاضی ہے** — پرویز

قرآن کریم، نظری پند و نصائح کا مجموعہ یا پوجا پاٹ کے طور طریقے سکھانے والی کتاب نہیں۔ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لئے عملی ہدایات دیتا ہے تاکہ ان کے مطابق انسان، ایک نظام متشکل کر کے صحیح انسانی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ زندگی جن ارتقائی مراحل کو طے کر کے موجودہ سطح (یعنی پیکرِ انسانی) تک پہنچی ہے اس میں طبیعی نظامِ حیات یعنی اس کے جسم کی پرورش اور نشو و نما کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ضوابط اخلاق و تمدن، تمام پند و نصائح، دین کا ہر قسم کا تقاضا، عبادات و مناسک شریعت، فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض، غرضیکہ ہر قسم کی راہنمائی صرف زندہ انسانوں کے لئے ہے، مردہ (یعنی انسان کی لاش) نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر، نہ گنہگار ہوتا ہے نہ معصوم۔ وہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بری اور ہر نوع کے حقوق و فرائض سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی جان (یعنی اس کی طبیعی یا جسمانی زندگی) اس قدر گراں بہا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا، اس نے گویا تمام نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا اس نے (یوں سمجھو گویا) تمام نوعِ انسان کی جان بچا لی۔ (۵/۳۲) اسی لئے اس نے جرمِ قتل کی سزا سنگین ترین مقرر کی ہے۔ (۴/۹۲-۹۳) اب ظاہر ہے کہ جب انسان کی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے تو جن اسباب و ذرائع پر اس کا دار و مدار ہے، ان کی اہمیت کس قدر ہو گی؟ ان اسباب و ذرائع کو، قرآن کریم کی اصطلاح میں رزق، اور (ہمارے ہاں) عرفِ عامہ میں روٹی کہا جاتا ہے۔ روٹی سے متعلق

## روٹی کے مسئلہ کی اہمیت

مباحث کو، دورِ حاضر کی علمی اصطلاح میں معاشیات اور علمِ معیشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے

روٹی کے مسئلہ یا معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے افتتاحیہ (یعنی سورۂ فاتحہ) میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ (۱/۵-۶)

اور سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ امن اور رزقِ فراواں، انعاماتِ خداوندی میں سے ہیں (۱۶/۱۱۲) اور بھوک اور خوف، خدا کا عذاب ہے (۱۶/۱۱۲) اس نے "جنتِ آدم" کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں نہ کسی کو بھوک اور پیاس کی احتیاج ستائیگی نہ مکان اور لباس سے محرومی ہوگی۔ (۲۰/۱۱۸) اس میں ہر شخص کو، جہاں بھی وہ ہوگا، فراوانی سے کھانے کو مل جائے گا۔ (۲/۳۵ ؛ ۷/۱۹) اس نے سورۂ طٰہٰ میں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو شخص ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کر دی کہ جس شخص کی یہاں روزی تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ (۲۰/۱۲۴)۔ دوسری جگہ کہہ دیا کہ جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا (۱۷/۷۲) سورۂ مائدہ میں ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کا اتباع کرتے تو ہم انہیں زمین و آسمان سے بکثرت کھانے کو عطا کر دیتے۔ (۵/۶۶) یعنی ان پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ (۷/۹۶)

**دعائے ابراہیمی** رزق کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے، کہ حضرت ابراہیمؑ جب "دنیا میں خدا کے پہلے گھر" کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو انہوں نے حریمِ کعبہ میں کھڑے ہو کر، خدا سے جو پہلی دعا مانگی اس میں کہا کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو یہاں کے رہنے والوں کو امن اور فراوانی سے سامانِ رزق عطا فرما (۲/۱۲۶) اس دعائے ابراہیمیؑ کو سورۂ ابراہیم میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (۱۴/۳۷) اور اہلِ مکہ کو اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ خدا نے انہیں کس طرح ہر خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور کس طرح ہر طرف سے رزق فراواں ان کی طرف کھنچے چلا آتا ہے۔ (۱۰۶/۱-۴)۔ (۲۸/۵۷)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے روٹی کے مسئلہ کو کسقدر اہمیت دی ہے اور اس کی یہی وہ اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے،

---

۱۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آیات کے صرف حوالے دیئے گئے ہیں۔ آپ انہیں قرآن کریم کے نسخہ سے خود دیکھ لیں اور ان کا مفہوم، مفہوم القرآن سے معلوم کر لیں۔ ان حوالوں میں اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت یا آیات کا۔

اس کے لئے چند نظری ہدایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مکمل عملی نظام عطا کر دیا ہے۔ میں آج کی نشست میں قرآن کے اس عملی نظام کو آپ حضرات کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس نظام کو سمجھنے کے لئے، دو ایک بنیادی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے جنہیں نظر انداز کر دینے سے وہ الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے ایک ہی معاشی نظام کو ایک گروہ عین مطابق اسلام قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے، کفر ہی نہیں بلکہ "کفرِ عظیم" ٹھہراتا ہے۔

## تمہیدی اصول

وہ تمہیدی نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی مخاطب قوم وہ تھی جس کے ہاں ایک ایسا معاشی نظام رائج تھا جو اس نظام کی یکسر ضد تھا جسے قرآن متشکل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک قائم شدہ نظام کی جگہ دوسرا نظام۔ جو اس کی یکسر ضد ہو، شباشب نہیں لایا جا سکتا، بالخصوص، جب اس نئے نظام کے لئے ان لوگوں کے قلب و دماغ میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی بھی ضروری ہو، جن کے ہاتھوں اسے متشکل ہونا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ تبدیلی تیئیس برس میں پیدا کی اور اس طرح اس قوم کو، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم بتدریج اس نظام تک لے گیا جو اس کی تعلیم کا منتہیٰ تھا۔ فساد، راتوں رات برپا کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب اسی طرح، بتدریج لایا جاتا ہے۔ قرآنی نظامِ معیشت کے سمجھنے کے لئے، ہمیں ان تدریجی کڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا جن کو ملاتے ہوئے وہ آخری منزل تک پہنچا تھا۔

قرآن کریم جس مرتب شکل میں امت کو دیا گیا ہے وہ اس کے نزول کی تاریخی ترتیب نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو سورۃ (یا آیت) سب سے پہلے نازل ہوئی تھی وہ قرآن میں سب سے پہلے رکھی گئی ہے، اور سب سے آخری سورۃ یا آیت وہ ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ترتیب میں ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا ورنہ میں اپنے مطالعۂ قرآن کی بناء پر اس کی وضاحت کرتا کہ جس کتاب عظیم کو تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے، ضابطۂ ہدایت بننا تھا، اس کے لئے یہی اندازِ ترتیب کس طرح انسب ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب قرآن کی موجودہ ترتیب، اس کی تنزیلی ترتیب نہیں تو ان کڑیوں کو کیسے مرتب کیا جائے گا جن کے مطابق، وہ اپنے نظام کو، اس کے نقطۂ آغاز سے، مقامِ تکمیل تک لے گیا تھا۔ بظاہر یہ مسئلہ کچھ دقت طلب سا نظر آتا ہے لیکن

**تدریجی کڑیاں**

درحقیقت ایسا نہیں۔ اگر قرآن کریم کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان تمام کڑیوں کو بآسانی آپس میں ملایا جا سکتا ہے جن کے اتصال سے ہم اس نظام کی پہلی کڑی سے آخری نقطہ تک، موجِ خرامِ یار کی طرح گل کترتے، بلا دقت و بلا تردد پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کا مطالعہ اسی انداز سے کیا ہے اور اس سے یہ راستے کتنے آسان ہو گئے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ ان کڑیوں سے بخوبی لگا سکیں گے جو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

**نشانِ منزل**

قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس منزل کا نشان واضح طور پر متعین کر دیا ہے جس تک وہ ہمیں بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس نشانِ منزل کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (1/1)

خدا موجبِ حمد و ستائش اس لئے ہے کہ اس نے جملہ اشیائے کائنات کی پرورش اور نشوونما کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اسے ربوبیتِ عالمینی کہتے ہیں اور یہ انتظام وہ ہے جسے خدا کے سوا نہ کوئی اور کر سکتا تھا، نہ کر سکتا ہے۔ نہ کر سکے گا۔ (35/3) خارجی کائنات میں اس کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح کارفرما ہے، یہ سوال ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے خارج ہے۔ کرۂ ارض کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ "اس میں کوئی ذی حیات (دآبۃ) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" (11/6) اور ان میں سے انسانوں کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کے، اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہم ہیں۔

(6/152) و (17/31) و (29/60)

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم ہر انسان کو براہِ راست رزق پہنچاتے ہیں۔ بالکل نہیں (36/47) ہماری یہ ذمہ داری، انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ جو انسانی نظام، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے، اور اس کے اس نظام کو قرآنی نظامِ معیشت۔ یعنی جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہونے کی مدعی ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی (رزق) بہم پہنچائے۔ اب آپ ان کڑیوں کو دیکھئے جن کے باہمی جڑنے سے

یہ نظام بتدریج اپنے مقامِ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

# منزلِ اوّل

## (انفرادی زندگی)

نزولِ قرآن سے، اس نظام کی آواز اس معاشرہ میں بلند کی جاتی ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں ایک طرف، ایسے متمول افراد ہیں جو اپنی دولت کے نشہ میں بدمست ہیں۔ اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال جو نانِ شبینہ تک سے بھی محروم ہیں۔ اس معاشرہ میں سب سے پہلے متمول لوگوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے ان مسکینوں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جائے گا۔ (۶۹/۳۳-۳۴ - ۷۴/۴۴)

**انفرادی اپیل**

اُخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا، اس سے ابھی زیادہ بحث نہیں کی جاتی۔ لیکن انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلا جس میں بیشتر انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم رہتے ہیں تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا، جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ اس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتلائے گا کہ یہ اس لئے ہوا کہ تمہارے ہاں عزت و تکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی۔ تم میں سے جو تنہا رہ جاتا تھا تم اسے عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتا تھا، تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے، نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ (۸۹/۱۵-۲۰)۔ ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعیٔ انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا تھا۔ ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پہ لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں، یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا،

اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا۔ (۷۶/۸-۹) یہ نہایت سخت گھاٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا (۹۰/۱۱-۱۶) جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعویٰ ایمان کی تکذیب کرے گا۔ (۱۰۷/۱-۳) تمہارے دعوئے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا کچھ دیتے ہو۔ (اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں)۔

## صدقات

اس کی ابتداء تم اپنے اعزہ و اقارب سے کرو اور پھر اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے، اپنے اور بیگانے کی تمیز سے بلند ہو کر، ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ (۲/۲۱۵، ۳۰/۳۸) لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو اس کے سر پر احسان کی منّ بھر کی سِل رکھ دو کہ وہ بیچارہ ساری عمر اس کے بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اسے لوگوں کو دکھا دکھا کر، اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقلِ فریب کار تم سے یہ کہے گی کہ ہم دوسروں پر خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ ان لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لئے لوگوں میں اس کا چرچا کریں، تو ہم اپنی دولت دوسروں پر خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے اسے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوقِ انسانیت محفوظ ہو جائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲/۲۶۱-۲۷۴)۔ (۳۹/۴۱)

## مال و دولت میں اصلاح

قرآن کریم نے اس پہلی اسٹیج پر، جہاں ایک طرف، ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پر ترغیب و تحریص دی، اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ باطل طور پر مت کھاؤ۔ (۲/۱۸۸)، (۴/۲۹) اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ، لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں۔ (۹/۳۴) یتیموں کے مال کی حفاظت کرو (۴/۲، ۶/۱۵۲، ۱۷/۳۴) اگر عورت کچھ کمائے تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ طور پر اس کے مالک نہ بن جائیں۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا۔ (۴/۳۲) لین دین کے معاملات کے متعلق تاکید کی کہ انہیں ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو۔ (۲/۲۸۲) مقروض اگر تنگدست ہو تو اسے قرض کی ادائیگی کے لئے مہلت دو۔ اور اگر اس میں ادائیگی قرضہ کی استطاعت نہ ہو، تو اسے قرضہ معاف کر دو۔ (۲/۲۸۰) اپنے ترکہ کے متعلق وصیت

کرو۔ (۲/۱۸۰ - ۵/۱۰۶) اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوتی، تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کرو جو قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔ (۴/۷ - ۴/۱۱-۱۲)، اور جن کی رُو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و مستاجر (مزدور) کے تعلقات میں حسنِ معاملہ کے سلسلہ میں بار بار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو، خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری، قاعدے اور معاہدے کے مطابق ادا کرو۔ (۶/۱۵۲ - ۷/۸۵ - ۱۱/۸۴ - ۱۷/۳۵ ؛ ۸۳/۱-۳)

**زرعی اصلاح** عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی اصلاح کی طرف مبذول کرائی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو، اور زمین کی پیداوار میں سے بھی (۲/۲۶۷)۔ اسے "خدا کا حق" کہہ کر پکارا گیا۔ (۶/۱۴۱) (ایسا کیوں کہا گیا، اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جو تمہارے موجودہ مقاماتِ عزت و تکریم کو الٹ کر رکھ دے گا، اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے "خدا کا حق" محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانۂ گندم جل کر راکھ ہو جائے گا۔ (۶۸/۱۷-۳۳) = (۱۸/۳۲-۴۴)۔ اور تمہارے بال بچوں تک تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ (۲/۲۶۶)

---

# منزل دوم

## (اجتماعیت کی طرف اقدام)

منزلِ اول میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں، وہ لوگ جو اس دعوتِ انقلاب کی صداقت کے قائل ہو گئے، اس داعیٔ انقلاب کے

---

ل حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق، مطالب الفرقان - جلد پنجم (ص ۱۳۱) دیکھئے۔

گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہئے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہوگیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ منزلِ اول میں، افراد سے کہا گیا تھا کہ وہ نادارون

## صدقات کا اجتماعی نظم و نسق

اور محتاجوں کی اپنے اپنے طور پر مدد کریں۔ (اسے "صدقات" سے تعبیر کیا گیا تھا) اب کہا کہ صدقات (اپنے عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ بلکہ اس مرکزِ نظام (یعنی نبی اکرمؐ)[۱] سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو (۹/۱۰۳) اور اس مال کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لئے ان مدات[۲] پر صرف کرو جن کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ (۹/۶۰) میں آیا ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اہلِ حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ "قرض اللہ کو دیا کرو" (۵۷/۱۸ - ۶۴/۱۷)۔ یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لئے اپیل کرے، تو جو کچھ کسی سے بن پڑے، اسے دے دیا کرے۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صرف کرے گا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد، جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہو جائے گا اور یہ نظام پوری طرح متشکل، تو جو کچھ تم اب "اللہ کو" بطور قرض دو گے، اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی۔ (۴۷/۳۸) لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا، تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لئے تم اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول نہ لو۔ (۲/۱۹۵) یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہوگی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۴۷/۳۸) انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وقت پر تمہارے کام آئے گا (۲/۲۶۸)۔ لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔ معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ ایسا سمجھنے والے (کہ ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچا لے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے، تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں۔ (۴/۳۷ - ۵۷/۲۴ - ۹۲/۸-۹)۔ یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہوگی، بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ (۹۲/۱۸) تمہاری طبیعی

---

۱۔ نبی اکرمؐ اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس نظام کے مرکزِ اول تھے۔

۲۔ یہ "صدقات" کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں "زکوٰۃ" کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

نشوونما بھی اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی جو درحقیقت منتہیٰ ومقصود ہے موجودہ سطح زندگی کی تمام تگ وتاز اور جدوجہد کا ـــــ انسانی ذات کی نشوونما کو اصطلاح میں "قربِ خداوندی" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حدِ بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔ یہ "تقرب الی اللہ" مال و دولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اسے "خدا کو دے دینے" سے ہوتا ہے۔ (۳۴/۳۹) اس میں شبہ نہیں کہ زن و فرزند کی طرح، مال و دولت میں بھی کشش وجاذبیت ہے (۳/۱۴)۔ لیکن اگر زن و فرزند

## مال و دولت کے نظام میں اصلاح

یا مال و دولت کی جاذبیت، اجتماعی مفاد انسانیت پہ غالب آجائے، تو یہی زن و فرزند اور مال و دولت فتنہ بن جاتے ہیں (۶۴/۱۵) اس لئے تم انفرادی مفاد پرستی کے فریب میں نہ آؤ۔ اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی (۶۴/۱۴-۱۶) انفرادی دولت جمع کرکے یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہوگئے ہو۔ تم خود کفیل (SELF-SUFFICIENT) ہوگئے ہو۔ قطعاً نہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہو جاتا ہے (۹۲/۸-۱۱ - ۹۶/۷)

## سائل و محروم کا حق

منزلِ اول میں، ضرورت مندوں کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے۔ تم انہیں بطور امداد کچھ دو۔ لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورتمندوں کا حق ہے۔ یعنی وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر، بطور استحقاق ـــــ (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں۔ (۵۱/۱۹ - ۷۰/۲۴-۲۵) اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کروگے، تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی حق کی ہوگئی۔ خیرات لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبۂ احسان ابھرتا ہے۔ لیکن جو چیز بطور حق وصول کی جائے، اس سے نہ لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری (INFERIORITY-COMPLEX) پیدا ہوتا ہے نہ دینے والے کے دل میں جذبۂ برتری (SUPERIORITY-COMPLEX)

## مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں، مالِ غنیمت بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا، اور ان کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں، جو کچھ کوئی دشمن کا لوٹ لے، وہ اسی کا ہو جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مالِ غنیمت، انفرادی ملکیت نہیں ہوگا۔ اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا۔ مرکز اس میں سے ایک حصہ، اجتماعی ضروریات کے لئے الگ کرکے، باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۴۱)

اس ایک تبدیلی سے، نہ صرف یہ کہ اس ذریعہ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہوگئی، بلکہ جنگ

کا جذبۂ محرکہ بھی بدل گیا۔ پہلے جنگ کا جذبۂ محرکہ لوٹ مار کا مال حاصل کرنا تھا۔ جو جتنا حاصل کر سکے، لے جائے۔ اب جذبہ، حقوقِ انسانیت کی مدافعت قرار پا گیا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں قتال فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔ واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے بلا مزد و معاوضہ کیا جائے، اسے قرآن کی رُو سے فی سبیل اللہ، یعنی اللہ کی راہ میں، کہا جاتا ہے۔

## دولت کا اکتناز

دولت اُسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں رہے۔ خود لفظ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ لیکن انفرادی ہوسِ زر پرستی، اسے گردش میں رکھنے کے بجائے، جمع کر کے روک لیتی ہے۔ اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام اُلٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز۔ یعنی اسے جمع کر کے روک رکھنا۔ سنگین ترین جرم ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑک گئے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے، دونوں، بُری طرح جھلستے اور جلتے ہیں۔ (۳۵-۳۴/۹) یہ شعلے، ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ (۷/۱۰۴) یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح، ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ (۱۸-۱۵/۷۰)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اسے پورے کے پورے معاشرہ کے رگ و پے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ (۷/۵۹)

## ربوٰ قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات و تاکیدات کے بعد، اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ روپیہ، مبادلۂ اشیائے ضروریہ کا ذریعہ ہے۔ اس سے از خود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے۔ اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہوگا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی رہے کہ وہ جتنی دیر بھی چاہے پڑا رہے، اس میں کوئی اضافہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھ چھوڑنا حماقت ہوگا۔ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی کو سود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آ ملے گا۔ یعنی اب آپکا روپیہ، اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ، محنت سے نہیں بلکہ روپے سے

از خود پیدا ہو، اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں ربٰوا کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ربٰوا کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم۔ ایسا جرم جسے اس نے، اسلامی نظام کے مدِ مقابل ایک باغی نظام قرار دیا۔ اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ سمجھیں۔ ($\frac{۲}{۲۷۵-۲۷۹}$) دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ ربٰوا سے تمہاری انفرادی دولت میں بے شک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظامِ معیشت کے نتائج و عواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجام کار اس سے اجتماعی دولت میں بے یکجہتی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ، دوسروں کی محنت کا غاصب بن کر، قوتِ عمل سے محروم اور سعاداتِ انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے، اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے۔ اور اس سے ان کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی ہے اور آخر الامر بھڑک اٹھتی ہے ($\frac{۳}{۱۲۹-۱۳۰}$)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی ربٰوا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم، دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ ان سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا، وہ بھی ربٰوا ہے۔ ($\frac{۳۰}{۳۹}$) اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ($\frac{۵۳}{۳۹}$) معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربٰوا ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

ربٰوا کو حرام قرار دے کر، قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔[۱]

## زمین کے متعلق اگلا قدم

اب آگے بڑھیے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت پڑتی ہے نہ ارسطو کے منطق کی حاجت۔ خدا نے اپنے آپ کو اَلْحَیُّ کہنے کے ساتھ اَلْقَیُّوْمُ بھی کہا ہے۔ یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ

---

۱ طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۴ء میں پرویز صاحب کا ایک جامع مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ الربٰو درحقیقت، نظامِ سرمایہ داری کی قرآنی اصطلاح ہے۔

ہیں کہ اس نے زندگی عطا کی تو زندگی کے قائم رہنے کے لئے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی، اسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیام زندگی کے لئے روشنی، حرارت، ہوا پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو انسان کے پیدا کرنے سے پہلے، مہیا کر دیا۔ روشنی، حرارت، ہوا اور پانی تو عام طور پر سطح ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ انسان، انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ ( ۱۵/۲۱ )
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ۔ ( ۱۵/۲۰ )۔ "ہم نے اس میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھا ہے اور ان کے لئے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو"۔ آپ غور کیجئے کہ "معیشت" کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ (۲۰/۵۴)۔ دوسری جگہ اس نے اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ کہا ہے۔ (۷۹/۳۳)

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ارض اور دیگر ذرائع حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رو سے، کوئی شخص، ان ذرائع حیات (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے مشترکہ اور یکساں وجۂ قیام زندگی ہوں۔ آج آپ کہہ سکتے کہ میں نے یہ قطعۂ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جایئے اور اس شخص تک پہنچ جایئے جس نے سب سے پہلے اس قطعہ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو اس پر، اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائع حیات میں سے کسی پر کسی شخص کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اس نوعِ انسان کے خلاف جرمِ عظیم ہے جس کی زندگی کے قیام کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانہ قدیم سے روا چلا آ رہا تھا تو یہ جائز چلی آ رہی تھی، قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لئے بڑے محکم دلائل پیش کئے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب "آسمانوں کے اوپر" خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی الوہیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح الٰہ السماء ہے، اسی طرح الٰہ الارض بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ

إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴) دوسری جگہ ہے۔ وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ (۶/۳) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا، کھلا ہوا شرک ہے (۶/۳)۔ سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم دو الٰہ اختیار نہ کرو۔ الٰہ صرف ایک ہے اور وہ الٰہ وہ ہے لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۱۶/۵۱-۵۲) سماوات اور ارض میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ اس لئے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر، انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ (۲/۲۲)۔ اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا اور تمام ذی حیات کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ (۲/۲۹)

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسول! اب تم ان سے پوچھو کہ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا۔ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے۔ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے لے کر دو۔ اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو سَيَقُولُونَ لِلَّهِ۔ انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۲۳/۸۴-۸۵) ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی ملک ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لئے حلال و طیب ہو گی، ورنہ تم شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو۔ (۲/۱۶۸)

## معاوضہ محنت کا

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں از خود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دلنشیں انداز میں واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف اپنی محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو۔ باقی خدا کا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو۔ تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو) اسی قاعدے کے مطابق، زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو، اور حقِ مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنئے۔ فرمایا۔

(اس مقصد کے لئے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہارے .....

پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے "قانون" کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً، تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا:۔

پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلّہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکار ہی گئے۔

اس کے بعد ہے:۔

پھر تم ذرا اس پانی پہ غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کر لیتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے، صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدرشناسی کیوں نہیں کرتے۔

اس کے آگے ہے:۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کرتے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کھو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا ..... رگِ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا۔ تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ:۔

رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں

تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہر حال اسی نتیجہ پہ پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو، باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا، اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصّہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے)۔ یہ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں، نہ خریدے ہوئے۔

یہ تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کیلئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں، محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہٰذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ، سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور ہمارا حصّہ ہمیں دے دو۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصّہ آپ کو کسطرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کر نے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (۴۱/۱۰ - ۵۱/۱۹ - ۷۰/۲۴-۲۵) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں، اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا۔ اور جو لوگ "بے حد و نہایت" زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے، ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس اسی قدر رقبہ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کافی ہو۔ اس طرح اس نے زمین پہ ذاتی ملکیت ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کر دی۔ سورۃ الرعد میں

## رقبوں کی تحدید

ہے کہ داعی انقلاب حضور نبی اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لئے میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے، کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے جواب میں کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو کہ اس کی تکمیل تمہاری موجودگی میں ہو گی یا تمہاری وفات کے بعد، تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ مکمل ہو کر رہے گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں اور خواہ اس کے بعد۔ تم دیکھتے نہیں کہ:

ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہو گی)؛ اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت

جلد حساب کرنے والے ہیں۔ (۲۱/۱)

سورۂ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاع حیات حاصل کرنے کے لئے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گذر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہ مالکانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔ (۲۱/۴۴) زمینداری کی بنا پر جو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، اس کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتدا کر دی

# تیسری منزل

## (تکمیلِ کار)

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ اب اسلامی مملکت وجود میں آگئی ہے اور خدا نے ربوبیتِ عالمینی اپنی تمام افراد کو سامانِ نشو و نما دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر لے لی ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود کی وجہ جواز تھی۔ سورۃ الحج میں ہے۔

### اسلامی مملکت کی وجہ جواز

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ ...... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجہ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ میں اس وقت "اقامتِ صلوٰۃ" کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ ایک جداگانہ موضوع ہے[1]۔ اپنے آپ کو ایتائے زکوٰۃ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ یہی ہمارا موضوع زیرِ نظر ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا" یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری "زکوٰۃ دینا" ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔

[1] اس موضوع پر اسی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہو رہا ہے۔

ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مالدار ایک خاص شرح کے مطابق، اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کر کے اسے متعین مصارف کے مطابق خرچ کرے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رُو سے، حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعینہ رقم ہے جسے مالدار (صاحبِ نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے، قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی اس میں "زکوٰۃ کے مصارف" کا کوئی ذکر ہے۔ (جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں نہ کہ زکوٰۃ کے۔ دیکھئے ۹/۶۰) زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما"۔ لہٰذا، "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہوں گے سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ اس سے بات صاف ہو گئی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیت عالمینی اور رزاقیت کی وہ ذمہ داری، جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، پوری کرے۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو کسطرح پورا کرے گی، اس کی تفصیل قرآن کریم میں بڑی شرح و بسط سے دی گئی ہے۔ اسی کا نام "قرآن کا معاشی نظام" ہے۔

**خدا سے معاہدہ** اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے)، اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)

یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا، اپنا مال اور اپنی جان، خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے (۹/۱۱۱)۔ اس طرح، ایک عبدِ مومن کا جان و مال، انفرادی ملکیت کے بجائے، اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اسے اس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت جس کا وعدہ خدا نے بے شمار مقامات پر کر رکھا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام میں، مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی وہ "خدا کا مال" ہو جاتا ہے۔ (۲۴/۳۳)

**اختلافِ صلاحیت** قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف بھی اور کم و بیش بھی۔ میں اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کسطرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اس امرِ واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے

کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآنی نقطہ نگاہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ قرآن کہتا ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں۔ (۴۳/۳۲) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا کہ "اکتسابِ رزق کے سلسلہ میں" مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اشتراک سے کمائی میں اس قدر اضافہ ہوا ہے۔ لوگ یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے؟ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے، وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزد و معاوضہ ملی تھی۔ (۱۶/۷۱ - ۱۶/۵۳) اس نے کہا کہ قارون

## قارونیت

(جسے قرآن نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) بھی اسی فریب میں مبتلا تھا جب اس نے کہا تھا کہ اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (۲۸/۷۸) میرا مال و دولت، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے۔ (۳۹/۴۹) دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کا احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا (۱۰۲/۸) تو (ہر چند اسے اس قسم کی باد پرسش پہ یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کے لئے) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیر خیرات کے طور پر "خدا واسطے" دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی جس طرح اس دنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب۔ ([illegible])

## قُلِ الْعَفْوَ

یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد، قرآن کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر طے ہو گیا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ انہیں

حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کسقدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ حتی کہ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ دوسرے کی ضرورت، تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے، تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔ (۵۹/۹)

اس (قل العفو کے) فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر کے رکھ دیا۔ اس سے کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) نہ رہی۔ اور جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قرض خواہ اور مقروض، مالک مکان اور کرایہ دار۔ زمیندار اور کاشتکار۔ کارخانہ دار اور مزدور۔ غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہو گیا — اور یوں

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

## زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افراد انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے (۵۵/۱۰) اس لئے ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ یہ ذریعہ رزق، تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ (۴۱/۱۰) یہ تمام نوع انسان کے لئے، خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) اور جو چیز تمام انسانوں کو بطور عطیہ ملی ہو، کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر سیاہ ٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حد بندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ، رزق کے ان چشموں کو جنہیں، آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر ضرورتمند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے، اپنے لئے روک لیتے ہیں، وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر مار دی جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کسقدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیکر نکال دیتا

اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ایسے نمازیوں کے لئے انجام کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے۔ وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۷/۱-۷) اور رزق کے آبِ رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیبِ دین نہیں تو اور کیا ہے؟

## ارض اللہ

زمین کی اس پوزیشن کو قرآن کریم نے، قوم ثمود کی تاریخ شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔ اس نے کہا کہ قوم ثمود کی معیشت کا مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گردونواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبرِ انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سرفرازانِ قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے ان سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۔ (۷/۷۳) یہ زمین خدا کی ہے۔ نہ تمہاری ہے نہ میری۔ اور یہ مویشی بھی اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیئے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے جہاں چاہیں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حدبندیاں قائم کر دو کہ اسی کی مخلوق اس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جا سکے۔ (۷/۷۳، ۱۱/۶۴)۔ انہوں نے کہا کہ اس کا عملی طریق کیا ہونا چاہیئے؟ حضرت صالحؑ نے کہا کہ یہ بڑی آسان بات ہے۔ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (۲۶/۱۵۵ - ۹۱/۱۳)۔ تم جانوروں کی باریاں مقرر کر دو۔ ہر جانور، بلاتخصیص اس کے کہ وہ کس کا جانور ہے، اپنی اپنی باری پر پانی پی لے۔ "باریاں مقرر کرنے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں ہر ایک کا اشتراک ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ارض اللہ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کوئی ذہنی تصور یا نظری

---

۱؎ سرزمین مدین میں اسی قسم کا واقعہ حضرت موسیٰ کے سامنے پیش آیا تھا۔ جہاں صاحبِ اقتدار سردار والے کے چرواہے کمزور و ناتواں لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ (۲۸/۲۳)

عقیدہ نہیں، یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعہ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا، اور عملاً اسے زید، بکر، عمر کی ملکیت میں دے دینا، قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ کفر ہے۔ تکذیب دین ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

باطنِ الارض لِلّٰہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند، کافر است

---

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق، وہ معاشی نظام جسے قرآن کریم، نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے متعین کرتا ہے۔ آپ اس کا نام کچھ ہی رکھیئے، میں اسے خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کی جہت سے، نظامِ ربوبیت کہہ کر پکارا کرتا ہوں [1]۔

## اس نظام کی مخالفت

یہ ہی نظام، حضرات انبیاء کرامؑ نے، اپنے اپنے وقت میں، اپنی اپنی قوم کے سامنے پیش کیا لیکن مترفین کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ مترفین کے معنی، ہمارے دَور کی اصطلاح میں، سرمایہ دار طبقہ (CAPITALISTS) ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (۳۴/۳۴)۔ ہم نے کسی قوم کی طرف کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس نے یہ انقلابی پروگرام پیش کیا ہو، اور وہاں کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔ اس آیۂ جلیلہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ یعنی

۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف سے جو نظام پیش کیا جاتا تھا، وہ نظامِ سرمایہ داری کی ضد تھا، اسی لئے سرمایہ دار طبقہ اس کی اس قدر مخالفت کرتا تھا۔ اور (۲) نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ خداوندی کی کشمکش، کچھ ہمارے دور کی خصوصیت نہیں جو یونہی ہنگامی طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر کوئی جماعت اس نظام خداوندی کو لے کر کھڑی ہو جائے، اور اپنی تگ و تاز میں استقامت سے کام لے، تو یہ نظام کامیاب ہو کر رہتا ہے، خواہ سرمایہ دار قوتیں اس کی مخالفت میں کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف کر دیں۔ سورہ انفال میں ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔ اس نظام کی مخالفت کرنے والے لوگ بے دریغ روپیہ خرچ کریں گے کہ عوام کو خدا کی راہ کی طرف آنے سے روکیں۔ فَسَيُنفِقُونَهَا۔ وہ اپنی ان مذموم کوششوں کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہانے چلے جائیں گے۔

---

[1] پرویز صاحب کی کتاب کا نام بھی نظام ربوبیت ہے جو قرآن کے معاشی نظام پر جامع تصنیف ہے۔

ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً - لیکن ان کا یہ روپیہ کسی کام نہیں آسکے گا - انہیں افسوس ہوگا کہ انہوں نے خواہ مخواہ اتنا روپیہ ضائع کیا۔ ثُمَّ يُغْلَبُونَ۔ (۸/۳۶) اس لئے کہ آخرالامر انہیں شکست ہوگی۔ مذہبی پیشوا۔ احبار و رہبان (علماء و مشائخ)۔ اس روپے کو، جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جانے کے لئے صرف کیا جائے گا، خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ لیکن اس کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ (۹/۳۴) یہ مطففین - جو اپنے واجبات تو پورے پورے وصول کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کے حقوق کبھی ادا نہیں کرتے، خدا کے راستے سے، پر کاہ کی طرح ہٹا دیئے جائیں گے۔ (۸۳/۱) یہ اس وقت ہوگا۔ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۸۳/۵)۔ جب عام انسانیت ربوبیت عالمین کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس وقت فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ اس قوم کی جڑ کٹ جائے گی جو سلب و نہب سے دوسروں کی محنت کی کمائی ہضم کر جاتی تھی۔

## الحمدللہ

یہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے۔ اس کے دوسرے ٹکڑے کو سامنے لانے سے پہلے میں اس عظیم حقیقت کو دہرا دوں کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا) قرآن کریم نے اپنی دعوت کا آغاز الحمدللہ رب العالمین سے کیا تھا یعنی خدا اپنی ربوبیت عالمینی کی وجہ سے مستحق حمد و ستائش ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس کی یہ ربوبیت، براہِ راست قائم نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے اور یہ قائم نہیں ہو سکتی جب تک ان ظالموں کی جڑ نہ کٹ جائے جو اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل رہتے ہیں۔ لہذا، ظالم قوم کی جڑ کٹے بغیر، نہ ربوبیت عالمینی وجود میں آسکتی ہے اور نہ ہی نوعِ انسان کی زبان پر بے ساختہ الحمدللہ رب العالمین آسکتا ہے۔ اب پوری آیت کو دیکھئے۔ فرمایا کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶/۴۵)

اور یہی اس جماعت کی دعوت کا منتہیٰ تھا جو اس انقلاب کی داعی بن کر اٹھی تھی۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۰/۱۰)

---

## وحی کی راہ نمائی

لیکن یہ نظام، وحی خداوندی کی راہ نمائی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بات میں محض عقیدۃً نہیں کہہ رہا، حقیقتہً کہہ رہا ہوں اور یہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انسانی جسم کی طرح، انسانی زندگی کے مسائل ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا انسانی زندگی کے مسائل اسی صورت میں سلجھ سکتے ہیں کہ انسان کو تمام ــــــ

(AS — A WHOLE) سامنے رکھا جائے۔ وحیٔ خداوندی نے، انسان کو تمام سامنے رکھ کر ایسی مستقل جامع اقدار دی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے، انفرادی اور اجتماعی زندگی نکھرتی اور سنورتی چلی جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ وحی خداوندی ایک مکمل نادر مولا دیتی ہے جسے اگر تمام عمل میں لایا جائے تو متعینہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس کے بعض اجزاء (بلکہ کوئی جزو بھی) چھوڑ دیا جائے تو مطلوبہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ یہی صورت انسان کے معاشی مسئلہ کی ہے۔ اسے اگر اس کی زندگی کے دیگر مسائل سے الگ رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اور الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ آپ سوچئے کہ اگر قرآن کے اس معاشی نظام کو جس کا خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، اور جس کی رُو سے، ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر لیتا ہے، کسی ایسی سوسائٹی میں رائج کر دیا جائے جس کے افراد کام چور اور سست الوجود ہوں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یا اگر رزق کی فراوانیاں ایسی قوم کے ہاں آجائیں جو عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی ہو، تو سامانِ زندگی کی یہی افراط ان کے ہاں کس قدر تباہی لے آئیگی! قرآن کی شہادت کے مطابق "کتنی ایسی بستیاں تباہ ہوگئیں جن میں رزق کی بڑی فراوانی تھی۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کوئی آباد نہ ہوا" (۲۸/۵۸)۔ لہٰذا، کوئی فلسفۂ زندگی، کوئی نظامِ حیات، جو انسان کو ایک طبیعی مشین تصور کر کے، صرف اس کی روٹی کا مسئلہ حل کرنے کی فکر کرتا ہے، کاروانِ انسانیت کو کبھی اس کی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ قرآن، انسانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا ایک گوشہ یا پہلو، اس کا معاشی نظام ہے۔ اس کے اس کلی نظامِ حیات کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ انسانی زندگی، اس کے جسم کی طبیعی مشینری کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ، اس میں ایک اور شئے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ اگر زندگی کی موجودہ سطح پر اس کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ، مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات کی نشوونما، وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک مستقل قدر یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لئے دے گا، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) وہ جو اپنا مال اس لئے دیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ عصرِ حاضر کا

## انسانی ذات

مشہور ماہرِ علم النفس (ERIC FROMM) اس حقیقت کو اپنے انداز میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا مقصد (TO HAVE) نہیں بلکہ TO BE ہونا چاہیئے۔ جسے قرآن، انسانی ذات کی نشوونما اور اس کا تزکیہ کہہ کر پکارتا ہے جو مال دینے سے حاصل ہوتا ہے یعنی (TO HAVE) کے برعکس زندگی کا مقصد قرار دینے سے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں علمِ انسانی کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے، قرآنی دعاوی کی صداقت کس طرح نکھر کر سامنے آتی جاتی ہے (۵۳/۴۲)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کا معاشی نظام قائم ہی ان لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے جو وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار، اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھتے ہوں۔ (اسے ایمان بالآخرت کہا جاتا ہے)۔

## ایمان بالآخرۃ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی دوسروں کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کا انصرام) وہی کر سکیں گے جو آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔ (۴۱/۷) اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (۴۱/۷) آخرت کا منکر ایتائے زکوٰۃ کر ہی نہیں سکتا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جو شخص سمجھتا ہے کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ اسے خوشحالی سے گزار لینے والا کامیاب ہے، اس کے لئے وہ جذبۂ محرکہ کیا ہو سکتا ہے جس کی رو سے وہ جان مار کر محنت کرے، اپنے لئے کم از کم رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دے۔ اگر آپ کسی ہنگامی تحریک سے اس کے دل میں اس قسم کا جذبہ پیدا بھی کر دیں تو وہ۔ اگر مانندِ شبِ ماند، شبِ دیگر نمی ماند۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ شعلۂ مستعجل، افسردہ ہو جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ سرمایہ داری پھر اس کا شعار بن جائے گی۔ سرمایہ پرست، آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن اس نظام کے نمائندہ قارون سے کہتا ہے کہ وہ اس انسانیت کُش نظامِ باطل کو چھوڑ دے، تو اس کی جگہ جس نظام کو تجویز کرتا ہے اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے۔ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (۲۸/۷۷) اس مال و دولت میں سے، اس دنیا کی زندگی کے لئے حصہ بھی لے اور آخرت کا گھر بھی سنوار۔ اور یہی آرزو اس جماعت کے دل میں بھی مچلتی ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی پیامبر بن کر اٹھتی ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کر دے اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ اور یہ چیز وحی کے عطا کردہ نظامِ حیات کی رو سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا

ایک پر تو قرآن کا معاشی نظام ہے۔ میں نے اپنی کتاب۔ نظامِ ربوبیت میں شرح وبسط سے بتایا ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کا معاشی نظام اس لئے کامیاب نہیں ہوا (اور نہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے) کہ اس نظام کے علمبردار نہ وحی پر ایمان رکھتے ہیں نہ اُخروی حیات پر۔ ان کے ہاں وہ اساس نہیں ہے جس پر اس قدر عظیم نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خود مسلمانوں کے ہاں بھی یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکے گا کہ قوم کو وحی کی صداقت اور اُخروی زندگی کی حقیقت پر یقین محکم ہو۔ اس کے لئے پہلے قوم کے دل و دماغ میں بنیادی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہو گی کیونکہ اس وقت یہ ایمان رسمی الفاظ سے زیادہ کچھ نہیں

---

میں نے اپنی بصیرت کے مطابق، قرآن کے معاشی نظام کی وہ کڑیاں آپ کے سامنے رکھ دیں جن سے وہ اسے تدریجاً اس کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کا قیام اسلامی مملکت ہی میں ممکن ہے (اسلامی مملکت وہ ہے جس کا جملہ کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے)۔ اسلامی مملکت جب اور جہاں بھی قائم ہو، اسے معاشرہ کی اس وقت کی حالت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اس نظام کی کون سی کڑی سے ابتداء کرے تاکہ اس کا قیام ممکن العمل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سطحی جذبات پرست، ابتداء ہی سے اس کی آخری منزل اختیار کرنے پر زور دیں گے۔ اور یوں یہ حقیقت شاعری بن کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف، وہ جس کی نگاہ قرآن کے کلی نظامِ حیات پر نہیں ہو گی، وہ اسے سرے سے ممکن العمل ہی نہیں سمجھے گا اور اسے ابزعمِ خویش "فطرتِ انسانی" کے خلاف قرار دے گا۔ (جیسا کہ آج کل، نظامِ سرمایہ داری کے نقاب پوش حامی (عام طور پر کہہ دیتے ہیں)۔ لہٰذا، اس نظام کے علمبرداروں کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنا نصب العین تو اس کی آخری منزل قرار دیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے عملی قدم بتدریج اٹھائیں۔ اسی طریق سے، قرآن کا معاشی نظام صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا اور اسی طریق سے یہ اب قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں البتہ ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ جب حضور نبی اکرمؐ نے اس انقلاب کی آواز بلند کی تھی تو آپ اکیلے مسلمان تھے، باقی سب غیر مسلم تھے۔ لیکن اب اسلامی مملکت کے باشندے مسلمان ہوں گے اس لئے ان سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کا نظام ہے اور قرآن پر تم ایمان رکھتے ہو۔ اس لئے تمہیں اس کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اس جہت سے ہمارا مرحلہ نسبتاً آسان ہو گا۔ لیکن شاید اسی جہت سے ہمارا مرحلہ زیادہ مشکل بھی ہو۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، رسول اللہؐ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اس کے بعد جتنے حضرات اسلام لائے، انہوں نے سمجھ سوچ کر اسلام قبول کیا۔ انہوں نے دین کے ایک ایک گوشے پر غور و فکر کیا۔ اس طرح وہ دل اور دماغ کے کامل یقین اور اطمینان کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے جب انہیں اس نظام کو قائم کرنے کے لئے کہا گیا تو یہ ان کے لئے نامانوس نظام نہیں تھا۔ ان کا اس کی نفع بخشیوں پر یقین اور اس کی محکمیت پر ایمان تھا۔ لیکن اب دنیا میں کوئی خطۂ زمین بھی ایسا نہیں جہاں کے مسلمان اس طرح ایمان لائے ہوں۔ اس لئے اگر کوئی مملکت اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنا چاہے گی تو اسے ان مسلمانوں کو (قرآن کے الفاظ میں) از سرِ نو مسلمان کرنا ہوگا۔ (۲/۱۳۳) اس کے خلاف سرمایہ دار طبقہ اور مذہبی پیشوائیت محاذ قائم کر لیں گے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اسلام وہ ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا، اور اس کے صحیح اسلام ہونے کی سند یہ ہے کہ وہ "اسلاف کا مسلک" ہے۔ مسلمانوں کی جو مملکت ان قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی، وہی اس نظام کو قائم کر سکے گی۔ لیکن اگر یہ اسے اپنے ہاں قائم نہیں کریں گے تو دنیا کی کوئی اور قوم اسے اختیار کر لے گی۔ قرآن تو پہلے ہی کہہ رہا ہے کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸)۔ "اگر تم اس سے اعراض برتو گے تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔"

اس مقام پر میں اس حقیقت کو ایک بار پھر واضح کر دوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روس یا چین نے اس نظام کا آغاز کر دیا ہے، تو یہ اگر مغالطہ آفرینی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ وہاں نہ اس نظام کو شروع کیا گیا ہے، نہ ہی یہ نظام چل سکتا ہے۔ مارکس نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل اس بنیادی اصول میں ہے کہ "ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام، اور اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ"۔ لیکن اسے وہ جذبۂ محرکہ نہ مل سکا جس سے لوگ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس لئے اس نے اس نظام (کمیونزم) کی جگہ سوشلزم کا نظام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس سے انسانیت، نظامِ سرمایہ داری سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑی گئی۔ جس نظریۂ حیات میں نہ خدا پر ایمان ہو نہ مستقل اقدار پر، نہ انسانی ذات پر ایمان ہو نہ اُخروی زندگی پر۔ اس کی رُو سے نظامِ ربوبیت کس طرح کارفرما ہو سکتا ہے؟ انہیں اس کے لئے بنیاد ہی نہیں مل سکتی۔ اس لئے اقبالؒ نے اس کے بارے میں کہا تھا۔

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

نہ ہی یہ نظام "مروجہ اسلام" کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے جو خود نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ یہ صرف قرآن کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے

# نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؛ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس:

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- مادیت کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح ناستوار ہیں۔
- ربٰوا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب، آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔

ضخامت سوا چار سو صفحات ــــ سنہری جلد ــــ قیمت فی جلد ساٹھ ۶۰/- روپے

ــــ علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور | ملنے کا پتہ | مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

# باب المراسلات

## ۱۔ طلاق طلاق طلاق

ہمارے ہاں جو استفسارات موصول ہوتے ہیں، ان میں اکثریت کا تعلق ازدواجی معاملات بالخصوص طلاق سے ہوتا ہے پہلے تو یہ سوال گاہے ماہے پوچھے جاتے تھے لیکن اب ان کی کثرت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے عوام بیشتر ان پڑھ اس لئے مذہب پرست ہیں۔ مذہب پرست قوم بڑی جذباتی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دین اپنے ہر حکم کی علت بیان کرتا ہے۔ یعنی وہ بتاتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے اس لئے اس کے پیرو ان احکام کی اطاعت دل و دماغ کے اطمینان کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس روش پہ گامزن قوم جذباتی نہیں ہوتی، شعوری اور فکری ہوتی ہے۔ مذہب چونکہ دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہوتا ہے اس لئے اس کا ہر حکم آمرانہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی علت یا وجہ نہیں بتاتا۔ اس کی بارگاہ میں "کیوں" پوچھنا کفر یا ارتداد کے مرادف ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس قوم کی عقل و فکر کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں، اور وہ جذباتی ہو جاتی ہے۔

ہماری قوم کی پہلے ہی یہ کیفیت تھی، جو معاشرہ کے موجودہ دباؤ نے اس کی حالت، بالکل "پریشر ککر" کی سی کر دی ہے۔ ناتسکین یافتہ جذبات سینے میں دبے رہتے ہیں، اور جب کبھی موقعہ ملتا ہے، بھاپ کیطرح امنڈ آتے ہیں۔ بقولِ غالب۔ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے۔ یہی وجہ ہے جو ہماری قوم بیحد زود رنج اور سریع الغضب ہوگئی ہے۔ اس میں تحمل اور سہار کا مادہ ہی نہیں رہا کسی سے بات کیجئے ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ معلوم وہ کس وقت "شارٹ" (SHORT) مار دے۔ ان کا یہ غصہ ہر کمزور پہ برستا ہے اور بیوی چونکہ ہمارے معاشرہ میں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے، اس لئے وہ آسانی سے اس کا صید زبوں بن جاتی ہے۔ ذرا سا غصہ آیا اور طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہدیے اس پہ سزائے موت (CAPITAL-PUNISHMENT) وارد کر دی۔ جب یہ پریشر ککر سے بھاپ نکل گئی تو پھر اپنے کئے پہ ندامت ہوئی اور اس کی تلافی کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ یہ وجہ ہے جو طلاق سے متعلق استفسارات کی کثرت ہو رہی ہے۔ یہ استفسارات کم و بیش اس قسم کے

ہوتے ہیں۔

میں نے غصہ میں آکر بیوی سے، طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیا یا لکھ کر دے دیا۔ اب میں اپنی اس حماقت پہ نادم ہوں۔ بیوی قریب المرگ ہو رہی ہے۔ بچے الگ رو رہے ہیں، مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نکاح ٹوٹ گیا۔ اب حلالہ کے سوا تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ آپ نجات کی راہ بتائیے۔

ان استفسارات کے انفرادی طور پہ جواب دینے میں ہمارا کافی وقت صرف ہوتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کی صحیح صورت بوساطت طلوع اسلام واضح کر دی جائے۔

(۱) قرآن کریم کی رُو سے، طلاق۔طلاق۔طلاق کہہ دینے طلاق واقع نہیں ہوجاتی۔اس نے طلاق کا ایک طریق مقرر کیا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ

جب کسی میاں بیوی میں اختلاف یا ناچاقی ہوجائے۔اور ان کی ذاتی کوشش سے مصالحت کی صورت پیدا نہ ہو سکے، تو اسلامی حکومت اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے، ایک مصالحتی بورڈ مقرر کرے جس میں ایک نمائندہ خاوند کا اور ایک بیوی کا ہو۔ وہ بورڈ ان میں مصالحت کی کوشش کرے۔

اگر وہ اس میں ناکام رہ جائے تو پھر مجاز اتھارٹی طلاق کا فیصلہ کرے۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵۔مزید تشریح کے طاہرہ کے نام خطوط۔یا قرآنی قوانین میں ملے گی)

(۲)۔ پاکستان میں قرآنی قوانین نافذ نہیں۔یہاں ان کے بجائے، عائلی قوانین نافذ ہیں۔ان میں طلاق کا طریق حسب ذیل بتایا گیا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہو تو طلاق کا اعلان کرنے کے بعد اس یونین کونسل کے چیئرمین کو تحریری طور پہ نوٹس دے گا۔جس کے علاقے میں اس کی بیوی رہتی ہو۔اس نوٹس کی ایک نقل وہ اپنی بیوی کو بھی بھیجا کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا (ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں)
چیئرمین نوٹس موصول ہونے پہ تیس دن کے اندر اندر صلح صفائی کی غرض سے ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا جس میں فریقین کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اگر اس کونسل کی تمام کوششوں کے باوجود فریقین میں صلح صفائی نہ ہو سکے تو مقررہ ضابطہ کے مطابق نوّے[(۹۰)] دن کی عدت کے بعد طلاق مؤثر ہوگی حاملہ عورت کی صورت میں عدت نوّے دن سے بڑھ کر وضع حمل تک شمار ہوگی۔ مطلقہ عورت کسی اور شخص سے شادی کئے بغیر دوبارہ پہلے شوہر کے نکاح

میں آسکتی ہے لیکن اگر طلاق تین بار مؤثر ہو چکی ہو تو پھر وہ پہلے خاوند سے دوبارہ شادی نہیں کر سکتی۔
(مسلم خاندانی قوانین۔ شائع کردہ حکومت مغربی پاکستان جولائی ۱۹۶۱ء)

یہ قوانین ۱۹۶۱ء میں جاری ہوئے تھے۔ حالیہ چیئرمین کونسل یا کسی وکیل سے پوچھ لیا جائے کہ اس طریق کار میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ عائلی قوانین کی مندرجہ بالا شق میں جو دیگر امور درج ہیں (مثلاً عدت۔ یا تین بار کی مؤثر شدہ طلاق) ان کے متعلق سردست بحث نہیں کی جاتی۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو صرف طلاق کے طریق تک محدود رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا قانون سے واضح ہے کہ رائج الوقت قانون کی رُو سے وہی طلاق جائز اور مستند ہوگی جو مندرجہ بالا طریق کی رو سے دی جائے گی۔ اپنے طور پر طلاق، طلاق، طلاق کہہ دینے سے طلاق واقع نہیں ہو جاتی۔

۳۔ عورت (بیوی) کے لیے طلاق حاصل کرنے کا بھی وہی طریق ہے جو مرد کے لئے ہے (یعنی مندرجہ بالا طریق) لیکن اس کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ اسے خاص طور پر نوٹ کر لینا چاہیئے۔ نکاح نامہ میں ایک خانہ ہوتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے۔ کیا خاوند نے طلاق حاصل کرنے کا حق بیوی کو تفویض کر دیا ہے۔

اس کے جواب میں لکھا نا چاہیئے۔ " بلا شرط تفویض کر دیا ہے "

اگر نکاح نامہ میں یہ لکھوا لیا جائے تو پھر عورت (بیوی) بھی مندرجہ بالا طریق کے مطابق آسانی سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ نہ لکھوایا ہو تو پھر اسے اس کے لئے عدالت میں جانا پڑتا ہے جو بڑے دردِ سر کا موجب ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شق کسقدر اہم ہے۔ نکاح کے وقت، لڑکی بیچاری کو تو "گونگی۔ بہری" بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے سرپرستوں کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے مستقبل کے تحفظ کے لئے نکاح نامہ میں مندرجہ بالا الفاظ لکھوا لیں۔

۴۔ بعض استفسارات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ "مولوی صاحب نے کہا ہے کہ تمہارے عقائد اس قسم کے ہیں، جن کی رُو سے تم پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا ہے۔ اس سے تمہاری بیوی پہ طلاق پڑ گئی ہے۔" بعض خدائی فوجدار طلاقیں، بندوق کے بھاؤ وارد کر دیتے ہیں۔ فرمان صادر ہوتا ہے "جن شوہروں نے فلاں کام میں شرکت کی ہے ان سب کی بیویوں پر طلاق پڑ گئی ہے" قارئین کو یاد ہوگا کہ جب بعض خواتین نے لاہور میں قانون شہادت کے خلاف جلوس نکالا تھا تو ایک مولانا صاحب نے فتویٰ داغ دیا تھا کہ اس جلوس میں جن شادی شدہ عورتوں نے حصہ لیا تھا ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں

(طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۸۳ء صہ ۱۲)

یاد رکھئے، نہ تو کسی مفتی صاحب کے کفر کے فتوے سے کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے نہ ہی

ان کے اس فتویٰ سے کہ فلاں عورت پر طلاق پڑ گئی ہے، وہ مطلقہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک کفر کے فتویٰ کا تعلق ہے، فتویٰ صادر کرنے والے مولوی صاحب کا جس بھی فرقہ سے تعلق ہو کسی دوسرے فرقہ نے اس فرقہ کے خلاف کفر کا فتویٰ عائد کر رکھا ہوگا۔ پاکستان (بلکہ دنیا بھر میں) کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ اگر کفر کا فتویٰ لگنے سے یہ مولوی صاحب کافر نہیں ہوگئے تو ان کے فتویٰ سے کوئی مسلمان کس طرح کافر ہو جائے گا؟ اگر کسی ایسے شخص نے جس کے خلاف ان حضرات نے کفر کا فتویٰ عائد کیا ہو، عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ اس سے اس کی تذلیل ہوئی ہے اور شہرت کو نقصان پہنچا ہے تو ان صاحب کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کا مذاق کسقدر مہنگا پڑتا ہے؟ مصر کے گورنر، حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ کسی شخص کو منافق کہہ دیا تھا تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا تھا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر صلح کر لو ورنہ میں تمہیں سزا دے دونگا۔ اس سے زیادہ کسی کی تذلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اسے منافق کہہ دیا جائے۔ یہاں اُٹھتے بیٹھتے کفر کے فتوے جڑتے رہتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ معاشرہ میں اب کوئی عمرؓ موجود نہیں

باقی رہی طلاق۔ سو اول تو نکاح کے لئے مولوی صاحب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر انہیں بلا بھی لیا جائے، تو لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر یہ ان کا نکاح کر نہیں سکتے سوجو نکاح ان کی مرضی کے بغیر باندھا نہیں جا سکتا اسے وہ توڑ کیسے سکتے ہیں؟ میاں بیوی کے سوا، کسی کے توڑنے سے نکاح ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور میاں بیوی کیلئے بھی نکاح کے توڑنے کے لئے (قرآن کی رو سے بھی اور مروجہ قانون کی رُو سے بھی) ایک قاعدہ مقرر ہے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

کفر کے فتووں اور طلاق کے حکمناموں سے معاشرہ میں جو انتشار پیدا ہوتا ہے اور متعلقہ فرد یا فریق جس کرب اور اذیت کا شکار ہو جاتا ہے، اسے روکنے کے لئے حکومت کو ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولوی صاحبان آئے دن عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کی تحریک چلاتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کی مخالفت کوئی نئی بات نہیں یہ مخالفت ان کے یوم نفاذ سے شروع ہو گئی تھی۔ اس کا جواب وہی ہے جو (اس وقت کے) صدر پاکستان فیلڈ مارشل، محمد ایوب خان (مرحوم) نے مفتی محمد شفیع (مرحوم) کے نام اپنے مکتوب مورخہ یکم جون ۱۹۶۱ء میں دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

میرا ایمان ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو ہر دور میں دنیا کی ہر مادی اور ذہنی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اگر آج مذہب اور زندگی ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں تو قصور سراسر ہمارا ہے۔ اسلام کا نہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دینی فہم اور بصیرت عطا کی ہے ان پر یہ عظیم ذمہ داری عائد

ہوتی ہے کہ وہ مذہب کو فضول توہمات اور تعصبات سے آزاد کرائیں تاکہ مذہب وقت کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ہمارے معاشرہ میں تعدد ازدواج کے پردے میں جو جو مظالم ہوتے ہیں ان سے نہ صرف بیشمار بے بس عورتوں اور معصوم بچوں کی زندگیاں تلخ اور دوبھر ہو جاتی ہیں بلکہ ہزاروں خاندان معاشی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں ستی کی رسم کو دنیا کا ہر شخص قابلِ نفرت سمجھتا رہا ہے لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کی ازدواجی بدعنوانیاں ستی کی رسم سے کہیں زیادہ ظالمانہ اور لرزہ خیز ہیں۔ ستی میں تو ایک ہی بیگناہ عورت کو آگ کے شعلوں میں دھکیل دیا جاتا ہے جن میں جل کر وہ خاکستر ہو جاتی ہے لیکن ہمارے معاشرہ میں لاتعداد عورتیں زندگی بھر جان لیوا مصائب کے دہکتے ہوئے الاؤ میں جلتی رہتی ہیں جو کہ موت سے بھی بدتر ہے"۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

---

## ۲۔ عورت کی دیت

سوال :۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کی نصف دیت کی تائید میں مولوی صاحبان یہ دلیل پیش کر رہے ہیں کہ قرآن مجید نے وراثت میں مرد کے مقابلہ میں عورت کا نصف حصّہ مقرر کیا ہے۔ اس لئے اس کی دیت بھی مرد سے نصف ہونی چاہیئے کیا یہ ٹھیک ہے؟

جواب:۔ قرآن کریم نے یہودی علماء کے خلاف جو جرائم عائد کئے ہیں ان میں سرِ فہرست یہ ہیں:۔ (۱) کتمانِ حق ($\frac{2}{42}$) یعنی حق کو چھپانا۔ (۲) التباسِ حق و باطل ($\frac{2}{42}$) یعنی حق و باطل کو گڈمڈ کر دینا۔ اور (۳) احکامِ خداوندی کو ان کے موقع اور محل سے ہٹا کر اپنے مطلب کے مطابق معانی پہنانا ($\frac{4}{46}$)۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ فقہ نے عورت کی نصف دیت مقرر کر دی۔ یہ حضرات اسے مطابق اسلام ثابت کرنے کے لئے قرآن کا (معاذ اللہ) جھٹلا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ($\frac{2}{175}$)۔ یہ ان کی کسقدر دیدہ دلیری ہے؟

ان کے دعوٰے کی بنیاد اس پہ ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے، ترکہ میں عورت کا حصّہ مرد سے نصف ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

۱۔ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ($\frac{4}{11}$)

اگر متوفی کی اولاد ہو تو اسکے ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہوگا۔

۲۔ اگر متوفی کلالہ ہو۔ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ... ($\frac{4}{12}$)

تو اس کے بہن یا بھائی میں سے ہر ایک کا چھٹا حصّہ ہوگا۔
ان احکامِ خداوندی کی رُو سے، مرد اور عورت دونوں کا حصّہ ایک جیسا ہے۔ البتہ بیٹی اور بیٹے کی صورت میں بیٹی کا حصّہ بیٹے سے نصف ہے (اس کی خاص وجوہات ہیں)
یہ حضرات ان آیات کو تو چھپائے رکھتے ہیں جن میں عورت اور مرد کا حصّہ یکساں ہے اور اس آیت کو ابھار کر سامنے لے آتے ہیں جس میں بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف ہے اور پھر اس دلیل سے عورت کی دیت مرد سے نصف قرار دیتے ہیں۔
آپ خود ہی سوچیئے کہ یہ کہاں کی دیانت اور کس قسم کی قانون سازی ہے؟ ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ قرآن منسوخ ہوتا ہے تو ہو، انکے مقتدا یان پر کسی قسم کا حرف نہ آنے پائے۔
وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ (۲/۱۶۵) ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے سوا انسانوں کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں اور جو محبت اور اطاعت خالص خدا کے لیے وقف ہونی چاہیئے۔ اسے ان خود ساختہ خداؤں کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔
کسی انسان کو قانون سازی کا حق دے دینا اور اس کے ساختہ قوانین کو ابدی قرار دیدینا اسے معبود بنا لینا ہے۔ ہم نے اپنے اسلاف کو یہی مقام عطا کر رکھا ہے۔

---

## انداداً من دون اللّٰہ

ان اَنداداً من دون اللہ کی دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔
محترم خلیل احمد الحامدی (کالعدم) جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن ہیں، مولانا مودودی (مرحوم) کی زندگی میں انہیں انکا دستِ راست سمجھا جاتا تھا۔ ۲۲ اگست ۱۹۸۴ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام میں عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ اس نے کیسے استدلال کیا ہے؟

۱۔ مصر کے استاد عبد القادر عودہ (رحمۃ اللہ) ان کا ارشاد ہے کہ

> فقہائے امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قتل میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوگی۔ اس کے لیے انھوں نے ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ بدائع الصنائع المغنی المہذب ـ شرح الدر دیر۔

(۲) مصر ہی کے ایک اور محقق احمد فتحی ہیں انھوں نے بقول مولانا حامدی؛

> اپنی تحقیق میں احادیث اور آثار اور فقہائے اسلام کے اقوال و آراء کو ہر دلیل کی بنیاد بنایا ہے اور کہا ہے کہ دیت کی شرعی مقدار میں عورت کے قتل خطا کی دیت مرد کے قتل خطا کی دیت کا نصف ہوگی۔

اس سارے مقالہ میں نہ حامدی صاحب نے، اور نہ ہی ان محققین نے جن کی

تحقیق کو سند قرار دیا گیا ہے، کہیں بھولے سے بھی) قرآن کا نام نہیں آنے دیا۔ یہ حضرات ان احادیث کو جو بخاری اور مسلم کے مجموعوں میں درج ہو گئی ہیں، سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں، لیکن اس "حدیث" کو (یعنی ارشادِ خداوندی جسے بلسانِ رسالت پیش کیا گیا ہے) نہ خود دیکھتے ہیں نہ دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ یعنی قیامت کے دن، رسول اللہ بحضور ربّ العزت فریاد کریں گے کہ

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

اے میرے رب! یہ ہے میری وہ امت جس نے (تیرے) اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

رسول اللہ یہ نہیں کہیں گے کہ انہوں نے احادیث کو چھوڑ دیا تھا۔ فقہ کے قوانین کو چھوڑ دیا تھا۔ حضورؐ یہی شکوہ کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ خود بھی چھوڑ دیا تھا اور کوشش کی تھی کہ کوئی اور بھی اس کا نام نہ لینے پائے۔

---

## احکام پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟

اکثر استفسارات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کو جب علم ہوتا ہے کہ یہ احکام خدا یا شریعت کے ہیں تو پھر وہ ان پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی ان پر عمل کرتے بھی ہیں تو اس میں استقامت نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ صدرِ اوّل کے مسلمان ان پر التزاماً عمل کیوں کرتے تھے؟

جواب:۔ آپ نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ "وہ پاگل ہے۔ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں" یعنی جسے اپنے نفع نقصان کا خیال نہ ہو اسے پاگل کہا جاتا ہے۔ صاحبِ عقل وہوش وہ ہے جو اپنے نفع نقصان میں تمیز کرے۔ انسان ہمیشہ اس چیز کو اختیار کرتا ہے جس میں اپنا نفع دیکھے۔ جب تک اس میں نفع ہوتا رہے، اسے اختیار کئے رکھتا ہے۔ عمل اور اس میں استقامت کا یہی راز ہے۔

خدا احکم الحاکمین ہے۔ لیکن وہ اپنے احکام کو ڈکٹیٹر کی طرح نہیں منواتا۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمْ۔ تاکہ اس سے یہ ہو" کیا ہو؟ خَیْرٌ لَّکُمْ ایسا کرو گے تو اس سے تمہارا یہ فائدہ ہوگا۔ یہ تمہارے لئے یوں بہتر ہوگا۔ اس کے لئے قرآن مجید سے بیشمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ روشن تر مثال وہ ہوگی جس کا آج کل خصوصیت سے چرچا ہے اور جو دن میں (کم از کم) پانچ مرتبہ بآوازِ بلند آپ تک پہنچتی ہے۔ اور وہ ہے اذان۔ اس میں پہلے کہا جاتا ہے حَیَّ علی الصّلوٰۃ۔ آؤ صلوٰۃ (نماز) کی طرف۔ اور اس کے ساتھ ہی کہا جاتا ہے۔ حَیَّ علی الفلاح۔ یعنی اس عمل کی طرف آؤ جس میں تمہاری فلاح وبہبود کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے

کہ یہ دعوت (بلادا) تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اگر یہ بتا سمجھا اور دکھایا جائے کہ ان اجتماعات میں شرکت کسطرح وجہِ فوز و فلاح ہوتی ہے۔ فوز و فلاح آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی۔ تو آپ دیکھیئے کہ کسطرح ہر شخص اس آواز کے سننے پر، بلا ترغیب و ترہیب اسکی طرف لپک کر جاتا ہے۔ وہ دلائل و براہین سے مطمئن کراتا ہے کہ اس حکم یا قانون کی اطاعت میں تمہاری یہ بہتری ہے۔ جو شخص اسطرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ (کہ اس میں اسکی یہ بہتری ہے) وہ اسے بطیبِ خاطر اختیار کر لیتا ہے اور جب اس پر عمل پیرا ہونے سے اسکی منفعت بخشیاں اس کے سامنے آجاتی ہیں تو وہ اس کے ساتھ متمسک رہتا ہے۔

اس کے سمجھانے کا طریق کیا تھا کہ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (یہ تمہارے لئے بہتر ہے) فرمایا ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۹/۴۱) یا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲/۴۴) اس کا منفعت بخش یا بہتر ہونا، علم و عقل کی رُو سے سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا! نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۲۹) بتایا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ یہ بھی بتاتے تھے کہ الکتاب (احکام خداوندی) کیا ہیں، اور یہ بھی کہ ان احکام کی غرض و غایت کیا ہے؟ ان پر عمل پیرا ہونا تمہارے لئے کسطرح بہتر ہوگا۔ جب وہ اسطرح مطمئن ہو جاتے تھے تو ان کے عمل میں خود بخود استقامت پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے احکام خداوندی پیش کئے جاتے ہیں، تو وہ اندھے بہرے بن کر ان کے سامنے گر نہیں پڑتے۔ علم و عقل کی رُو سے مطمئن ہو کر (کہ ان پر عمل پیرا ہونا ان کے اپنے حق میں ہے) ان کے سامنے سر تسلیم کرتے ہیں۔ اور جب ان پر اسطرح عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس عمل میں لازماً استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ (۴۱/۳۰)۔ اس کے بعد اگر کبھی ایسا ہوتا کہ ان سے سہواً کوئی لغزش ہو جاتی (خواہ اسے کوئی دیکھنے والا بھی نہ ہوتا) تو وہ بارگاہِ رسالت (یا خلافت) میں از خود حاضر ہوتے اور گڑگڑا، گڑگڑا کر درخواستیں کرتے کہ ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا۔ ہم غلطی سے اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں۔ اس کی تلافی کی صورت بتا دیجئے۔

اس کے بعد جب ملوکیت آگئی تو احکام کی غرض و غایت اور علم بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے کہ وہ احکام اربابِ اقتدار کی بہتری کے لئے ہوتے تھے۔ رعایا کی بہتری کے لئے نہیں۔ رعایا سے انہیں جبراً منوایا جاتا تھا سیاست کی اس روش کا اثر اربابِ شریعت پر بھی ہوا۔ وہ بھی اپنے احکام کو کفر اور ارتداد کے فتووں کے زور سے منوانے لگے۔ شریعت میں "کیوں" کا سوال عمل شیطان قرار پا گیا (اول من قاس ابلیس کا مقولہ۔ یعنی جس نے سب سے پہلے کیوں پوچھا تھا (ابلیس تھا) فرمانِ الٰہی کی طرح پیش

کیا جانے لگا۔ جبر کی اطاعت، خواہ وہ سیاست میں ہو اور خواہ شریعت میں، یا تو میکانیکل (عادۃً) ہوتی ہے اور یا منافقانہ۔ منافق ہر وقت گریز کی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ جنگلی چوہا، بل کے اندر گھسنے کے لئے تو ایک سوراخ بناتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر متعدد اور سوراخ بنا کر ان پر مٹی کی باریک سی پپڑی بچھا دیتا، اور انہیں بند رکھتا ہے اور اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب اسے کوئی دشمن بل کے اندر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کے سوراخوں کو اَلنُّفَقَۃ کہا جاتا ہے۔ اس سے منافق کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ وہ طوعاً وکرہاً اطاعت کرتا ہے لیکن اس سے گریز کی راہیں بھی تلاش رکھتا ہے۔

جن احکام کی اطاعت دل اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ نہ کی اور کرائی جائے، مرورِ زمانہ سے ان کی حالت یہی ہو جاتی ہے کسی کو مطمئن کرا لیجئے کہ اس بات کے ماننے سے تمہارا یہ فائدہ ہوگا۔ پھر کوئی پاگل ہی ہوگا جو اسے نہ مانے!

---

## اسے کہتے ہیں سیاست

حکومت کی طرف سے سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد ہوئی تو جماعت اسلامی کے ساتھ بھی (کالعدم) لکھا جانے لگا، لیکن وہیں سے ایک اور تنظیم کی نمود ہو گئی جس کا نام بتایا گیا۔ تحریک اسلامی، اس کے بعد اس نام سے وہ سب کچھ ہوتا رہا جو (کالعدم) جماعت اسلامی کرتی تھی یا ہیں ہم، کوشش یہ کی گئی کہ یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ تحریکِ اسلامی کے پردے میں وہی جماعت اسلامی پائے کوب ہے۔ اب معلوم نہیں مصلحت کا کیا تقاضا ہوا کہ یہ نقاب الٹ دیا گیا۔ جماعت کے ترجمان۔ ایشیا کی ۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں "منصورہ کے شب و روز" کے زیرِ عنوان ایک روئداد شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے:

تحریکِ اسلامی کا ۴۳ واں یومِ تاسیس

رموزِ سیاست سے ناآشنا ذہن حیران رہ جاتا ہے کہ "تحریک اسلامی" تو ابھی کل تولد ہوئی تھی۔ اس کی ۴۳ ویں سالگرہ کیسے منائی گئی؟ متن میں بات کھل کر سامنے آگئی۔ تحریر ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے احیائے اسلام کی تحریک کا جو ننھا سا پودا لگایا تھا وہ .... آج ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

اس کے بعد مولانا گلزار احمد مظاہری نے دو ٹوک بات کر دی جب کہا کہ

۴۳ سال قبل جماعت اسلامی کے قیام کے وقت (۷۵) کے قافلے میں جو افراد شریک تھے، ان میں سے صرف (۵،۶) افراد ہی بقیدِ حیات ہیں۔

حالانکہ خود قائد تحریک اسلامی میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا۔
۴۳ سال قبل جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ :-
یعنی ان حضرات نے خود ہی یہ راز فاش کر دیا کہ "تحریک اسلامی" درحقیقت وہی جماعت اسلامی ہے جس کی بنیاد (۴۳) سال پہلے رکھی گئی تھی اور جسے حکومت نے کالعدم قرار دے رکھا ہے۔ چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد۔
اسے کہتے ہیں سیاست (یعنی "اسلامی سیاست"!)

---

## ایک قانونی نکتہ کی وضاحت :-

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔
کتاب "قرآنی قوانین" میں طلاق کے سلسلہ میں کہا گیا ہے :
۱۔ دیکھئے قرآن کریم اس سلسلہ میں معاشرہ کو کیا ہدایات دیتا ہے۔ (صـ۶۷)
۲۔ معاشرہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ ثالثی بورڈ مقرر کرے۔ (صـ۶۸)
۳۔ میاں بیوی میں صلح صفائی نہ ہو سکے تو پھر وہ ثالثی بورڈ مقرر کرالیں (صـ۶۸)
ان تصریحات سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ میاں بیوی، معاشرہ (پبلک) میں سے جنہیں چاہیں، بطور ثالثی بورڈ مقرر کرالیں۔
کیا قرآنی قانون کی یہ تعبیر صحیح ہے؟

**طلوعِ اسلام** نہیں، یہ تعبیر صحیح نہیں۔ یہ ثالثی بورڈ حکومت کی طرف سے مقرر ہوگا۔ اس کی وضاحت وہیں (چند سطریں آگے جا کر) کر دی گئی ہے جب کہا ہے کہ :-

اگر اس طرح مصالحت نہ ہو سکے تو جس ادارہ (عدالت) نے ثالثی بورڈ کا تقرر کیا تھا وہ فسخ نکاح کا اعلان کرے (صـ۶۹)

ذرا آگے چل کر لکھا ہے :

اس سے واضح ہے کہ طلاق کا مسئلہ انفرادی نہیں کہ جب کسی کا جی چاہا بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کا فیصلہ عدالتِ مجازہ کی طرف سے ہوگا۔ وہ پہلے مصالحتی بورڈ قائم کرے گی اور اگر مصالحت کی کوشش ناکام رہ جائے گی تو پھر طلاق کا فیصلہ کرے گی۔ (صـ۶۹)

اس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے، ثالثی بورڈ کا تقرر، اور طلاق کا فیصلہ وہ عدالت کرے گی جسے حکومت کی طرف سے اس کا مجاز قرار دیا گیا ہو۔

ایسے معاملات میں بعض اوقات، امت یا معاشرہ کے الفاظ اس لئے استعمال کر دیئے جاتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے، حکومت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے، نہ افراد کے گروہ کی۔ وہ ساری کی ساری امت کی ہوتی ہے، اسلامی معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس بناء پر بعض اوقات، حکومت کی جگہ امت یا معاشرہ کے الفاظ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ اصول یہ یاد رکھئے کہ جہاں بات قانون یا ضابطہ کی ہوگی، وہاں الفاظ کچھ بھی ہوں، مراد اسلامی حکومت یا اس کی طرف سے مقرر کردہ مجاز اتھارٹی ہوگی، خواہ وہ عدالت ہو یا کوئی اور ادارہ۔ قرآن کریم نے، قوانین کے نفاذ۔ مقدمات کے تصفیہ حتیٰ کہ مجرموں کی سزاؤں کے ضمن میں کہیں بھی حکومت یا عدالت کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ وہ "یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (امت یا اسلامی معاشرہ) ہی سے خطاب کرتا ہے۔ یہ امت ہے جو مختلف امور کی سرانجام دہی کے لئے، مختلف افراد یا ادارے مقرر کرتی ہے قرآن، عدالت یا حکومت کی جگہ پوری کی پوری امت (یا ایھا الذین آمنوا) کو کیوں مخاطب کرتا ہے، اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے جس تک ابھی دنیا کے نظامِ حکومت و عدالت کی نگاہ نہیں پہنچ سکی۔ (اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں)

---


# طاہرہ کے نام خطوط

**پرویز** صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر حصہ انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علومِ حاضرہ کی روشنی میں سمجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ـــــ قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک ـــــ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

# ایک قدیمی رفیق کی جدائی

اگر آپ کبھی ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں آئے ہوں تو آپ نے ہمارے ایک معاون کو دیکھا ہوگا صحت مند، تنومند و توانا، سر جھکائے اپنے کام میں منہمک۔ رسالہ کی ترسیل کا فریضہ ان کے ذمہ تھا جسے وہ نہایت تن دہی کے ساتھ سرانجام دیتے تھے۔ صدہا خریداروں کا "حدود اربعہ" ان کے نوک زبان تھا اس لئے وہ اس ضمن میں ہر سوال کا جواب متبسم اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیتے تھے۔ یہ تھے ولی اللہ خان بالکل اچھے بھلے گھر گئے۔ گیارہ بجے رات تک اہل خانہ سے باتیں کرتے رہے۔ صبح انہیں جگانے گئے تو وہ موت سے ہمکنار ہو چکے ہوئے تھے۔ ۲۴ اگست کی صبح کا واقعہ ہے۔ اس ناگہانی حادثہ کا ادارہ کو سخت صدمہ ہوا۔

اس کا ایک قدیمی مخلص، قابل اعتماد رفیق جدا ہو گیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر کی توفیق۔

# رشتے مطلوب ہیں

(۱) ایک اٹھائیس سالہ نوجوان کے لئے جو کچھ عرصہ بیرون ملک رہنے کے بعد اب پاکستان میں اپنا کاروبار کرتا ہے۔ لڑکی خوش شکل اور خوش سیرت، کم از کم انٹرمیڈیٹ تک تعلیم یافتہ۔ عمر بیس بائیس سال تک۔ جہیز کا کوئی مطالبہ نہیں۔ لاہور یا راولپنڈی سے رشتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ جواب کے لئے

(معرفت ادارہ طلوع اسلام (ممبر ع۔ خ

(۲) کینیڈا میں مقیم، برسر روزگار، پچاس سال سے زائد صاحب عمر کے لئے عقد ثانی مطلوب ہے۔ سابقہ بیوی کو طلاق ہو چکی ہے۔ رشتہ کے لئے بچوں والی بیوہ، تعلیم یافتہ، غریب خاندان سے متعلق، نرم خو، متحمل مزاج خاتون کو ترجیح دی جائے گی۔

خط و کتابت (ک۔ م۔ خ) معرفت ادارہ طلوع اسلام

(۳) ایک سابقہ حیدرآبادی فیملی سے متعلق لڑکی کے لئے، جو جی ایس سی اور آئرلینڈ کے گرامر اسکول سے پاس شدہ ہے، رشتہ مطلوب ہے۔ عمر چوبیس سال۔ رنگ صاف، نقش اچھے، کراچی۔ لاہور یا لنڈن میں مقیم برسر روزگار خواہشمند رابطہ قائم کریں

(م۔ ی) معرفت ادارہ طلوع اسلام

باسمہٖ تعالےٰ

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست
مسلماں لایموت از رکعتِ اوست
نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز
قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

# الصّلوٰۃ

پرویز

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ ۲ لاہور

# الصّلوٰۃ

## (قرآن کے آئینے میں)

پچھلے دنوں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہوتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں نماز (صلوٰۃ) کا مفہوم مقصود واضح کیا جائے۔ صلوٰۃ چونکہ اسلامی نظام کی اساس ہے اس لیئے اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں جستہ جستہ بکثرت لکھا گیا ہے۔ جامع طور پر یہ موضوع پرویز صاحب کی لغات القرآن میں بارہ تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ میں عنوان یُقِیمُونَ الصَّلوٰۃَ (آیت $\frac{۲}{۳}$) کے تابع پورے باب پر۔ ذیل میں اس باب کے اقتباسات درج کیئے جاتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر تشنگی محسوس ہو تو آپ مطالب الفرقان خود ملاحظہ فرمالیں۔ اس مضمون میں جہاں یہ آئے گا کہ اس کی تشریح دوسرے مقام پر کی جائے گی تو اس سے مراد مطالب الفرقان کا کوئی دوسرا مقام ہو گا۔

اس مقالہ میں بعض اضافے بھی کیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ مطالب الفرقان کے مقابلہ میں خود مکتفی ہو گیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

### صلوٰۃ کے لغوی معنی

صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے ویسے اس کا مادہ (ص۔ل۔ی) بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ فنی بحث ہے جسے میں نے "لغات القرآن" میں بیان کیا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں، کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ چونکہ عرب، نظری اور تجریدی حقائق کا مفہوم محسوسات کے ذریعے واضح کیا کرتے تھے اس لیئے ان کے ہاں گھڑ دوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر اس طرح مسلسل دوڑتا جاتا کہ اس کی کنوتیاں پہلے نمبر والے گھوڑے کی سُرین سے مل رہی ہوں تو وہ آگے جانے والے گھوڑے کو "سَابِق" کہتے تھے اور اس دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّی۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (یعنی ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لغت کی اہم کتاب تاج العروس میں ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں لزوم (وابستگی) یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس جہت سے قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صلوٰۃ کے معنے ہوں گے نظامِ خداوندی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ اس بنا پر صلوٰۃ کے معنی خدا کی طرف سے متعین کردہ

فرائضِ منصبی کے بھی آتے ہیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ " الصلوٰۃ " سے مفہوم صرف نماز نہیں۔ اس میں پورے کے پورے قوانینِ واحکامِ خداوندی اور اس کے عائد کردہ فرائضِ منصبی آجاتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں مومنین کی دعا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱/۵) اور سورۃ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶) "میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔ نظر بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے گویا خدا صراطِ مستقیم پر آگے آگے جا رہا ہے اور مومنین اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی دعا مانگ رہے ہیں۔ (صلوٰۃ میں یہی مفہوم مضمر ہے) لیکن اس طرح کا تشبیہی مفہوم خدا کے تنزیہی تصور کے خلاف ہے اس لئے اس سے مراد وہ نظامِ کائنات ہوگا جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ النور کی اس آیت سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۲۴/۴۱) "کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ارض و سماوات کی ہر شے اور فضائے سماوی میں پر فشاں پرندے خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہے۔" لفظ تسبیح کی تشریح تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گی یہاں مجملاً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ اس کے معنی ہوتے ہیں، مقصد پیش نظر کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کرنا اور اس کے لئے اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر دینا۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ بات واضح ہے کہ کائنات کی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ منصبی کیا ہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے جس کے لئے انہیں مصروف جد و جہد رہنا ہے۔ یہاں سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ فرائض جو خدا کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔

دوسرے مقام پر قرآن کریم نے خود انسانوں کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ الصلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا۔ اس کے قیام سے کیا حاصل ہوتا ہے اور اس کے ضائع کر دینے سے کیا تباہی آتی ہے۔ سورۃ مریم میں پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا تذکرہ آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (۱۹/۵۹)۔ ان کے بعد، ان کی امتوں میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے الصلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے کیا کیا جس سے الصلوٰۃ کا ضیاع ہو گیا۔ کہا وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹/۵۹) وہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتباعِ جذبات دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے [دیکھئے (۱/ـ)] کہ انسانی جذبات کی تسکین بری چیز نہیں

بشرطیکہ ان کا اتباع حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کیا جاتے۔ یہ تباہیاں اس وقت لاتے ہیں جب یہ سرکش اور بیباک ہو جائیں۔ لہٰذا الصلوٰۃ کے معنی ہوتے انسانی خواہشات و جذبات کی،

## ضیاعِ صلوٰۃ

قوانینِ خداوندی کے مطابق، تسکین و بہرہ مندی۔ آن سے، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوتے کام لینا۔ انہیں قوانینِ الٰہیہ کے پیچھے پیچھے چلانا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اجتماعی نظام کے تابع ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ نظام جس میں مختلف افراد اپنے اپنے مفادات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے خدا کے متعین کردہ نصب العین کی طرف بڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ الصلوٰۃ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے جب جماعت مومنین کو تمکنِ فی الارض حاصل ہو۔ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ

## اپنی آزاد مملکت کی ضرورت

جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا، ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی (۲۲/۵۵) تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے اور مروجہ (اڑھائی فیصد) زکوٰۃ دینے کے لیے اپنی حکومت کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ مروجہ طریق پر یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کیے جا سکتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حق حاصل تھا اور آج ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے۔

متحدہ ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ اس نکتہ پر بھی بحث ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو نماز، روزے کی آزادی ہوگی۔ اس لیے اس مقصد کے لیے مسلمانوں کے لیے الگ مملکت کی کیا ضرورت ہے؟ انہیں بتایا جاتا تھا کہ نماز، روزہ اور دیگر اسلامی احکام پر جس طرح غیر مسلموں کی حکومت میں عمل کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس سے ان احکام کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو قرآن کی بنیادوں پر قائم ہو۔ حتیٰ کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بھی غیر قرآنی اصولوں پر قائم ہو تو اس میں بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی مملکت کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸) مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے

ہیں یعنی اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہے اسے نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔" (یہی ایتائے زکوٰۃ کا مفہوم ہے) یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ وہ نظامِ مملکت ہے جس میں تمام امورِ جماعتِ مومنین کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوعِ انسان کی ربوبیت ہے۔ یعنی تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا۔ چونکہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کے لیے قائم ہوتا ہے اس لیے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰) یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس طرح اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اُسے قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں واضح کر دیا ہے۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوتِ خداوندی کو پیش کیا تو حسبِ معمول انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ شدید کشمکش

## الصَّلٰوۃ اور معاشیات

کے بعد قوم نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں؟۔ آپ نے فرمایا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا ہوں (کہ اس میں آپ لوگ مخل نہ ہوں) اس مذہب پرست قوم نے اپنے خیال کے مطابق سمجھا کہ یہ اپنے طریق پر خدا کی پرستش کی اجازت چاہتے ہیں۔ اس میں کون سی حرج کی بات ہے۔ یہ جس طرح جی چاہے پوجا پاٹ کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ اس پر رضامند ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صلوٰۃ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب وہ نہیں تھا جسے وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷) اسے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس صلوٰۃ کی تو ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

آپ اس آیۂ جلیلہ کے آخری حصہ پر غور کیجئے جس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ صرف نماز کا نام نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔

ہم نے سورۃ حج کی آیت (۲۲/۴۱) میں دیکھا ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گی تو وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) یہ حقیقت ہے کہ الصلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ فحشاء کی تفصیلی بحث تو آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو منکر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں پہلے

نہی عن المنکر، مملکت کا فریضہ بتایا گیا اور یہاں یہ کہا گیا کہ یہ کام الصلوٰۃ کرے گی۔ یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ اس نظام ہی کا نام ہے جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے، کتنے نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود منکرات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا منکرات، نظامِ صلوٰۃ (اسلامی نظامِ مملکت) ہی سے رک سکتے ہیں۔ منکر کے بعد فحشاء کو لیجئے۔ لفظ فحشاء کا مادہ (ف ح ش) ہے جس میں ہر امرِ شنیع (قابلِ نفرت) آجاتا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں، جب فحش لفظ بولا جاتا تھا تو اس کے معنے عام طور پر بے حیائی کے لئے جاتے تھے لیکن فحشاء کے معنی بخل کے تھے کیونکہ ان کے ہاں بخل انتہائی درجہ کی قابلِ نفرت خصلت تھی۔ جہاں تک منکر کا تعلق ہے اس میں بھی ہر معیوب

## صلوٰۃ اور معاشی نظام کا تعلق

بات آجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں عقلِ خود بین (یعنی صرف اپنا ہی مفاد سوچنے والی عقل) کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں۔ عقل کو اگر وحی سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا منصب یہ رہ جاتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے ہر فعل اور فیصلہ کے لئے جواز کی دلیلیں سجھاتی اور سمجھاتی رہے۔ بنا بریں الصلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ انسان کے دل سے بخل کے جذبات نکال دیتی ہے اور عقلِ خود بین کو اس کے جواز کی راہیں سمجھانے کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ غایت کے اعتبار سے الصلوٰۃ اور معاشی نظام میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر صلوٰۃ کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ سے ہر قسم کی بے حیائی ختم ہو جاتی ہے، اور افرادِ معاشرہ کے دل سے بخل کی تنگ نظری اور خود غرضی کے جذبات نکل جائیں اور ان کی جگہ وسعتِ قلب اور کشادہ دستی کے جذبات پیدا ہو جائیں جن کی رو سے زندگی کا مقصد اپنے مفاد کا حصول ہی نہ ہو بلکہ نوعِ انسان کی منفعت ہو۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تمہارا اسی عمل، اسی نظریہ، اسی نظام کے لئے ہے جس سے مقصود نوعِ انسان کی منفعت ہو ($\frac{13}{17}$)۔ صلوٰۃ کا نتیجہ اس قسم کا تغیرِ نفسی ہونا چاہیئے۔

سورۃ الماعون، (۱۰۷) میں کہا گیا ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱/۱۰۷) تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو دین کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ذکر ان کا ہے جو دین سے متمسک ہونے کے مدعی ہیں۔ (یعنی ہماری طرح اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں) لیکن عملاً دین کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں جس سے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ فرمایا: فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۲-۳/۱۰۷) یہ وہ ہے کہ جو اس شخص کو، جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے، دھکے دیتا ہے (لفظ یتیم میں وہ بچے بھی آجاتے ہیں

جن کے ماں باپ مر چکے ہوں اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا ——— کسمپرسی کے عالم میں رہ جائیں)۔ ان لوگوں کو دھکے دینے کا مفہوم سورۃ الفجر کی ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ اگر اس پر رزق کی تنگی آ جاتی ہے تو چلا اٹھتا ہے کہ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶)۔ دیکھیئے! خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا۔ میں نے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کی مجھے اس طرح سزا ملتی۔ کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہمارے ہاں سے کسی پر ذلت و خواری کا عذاب یونہی مسلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمہاری ذلت و خواری تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اعمال یہ تھے: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) تم ان لوگوں کو مستحقِ تکریم و احترام نہیں سمجھا کرتے تھے۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے۔ تمہارے نزدیک واجب التکریم وہی لوگ قرار پاتے تھے جن کا جتھہ (پارٹی) بڑا ہو۔ تمہارا دوسرا جرم یہ تھا وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۸) جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے (جن کی حرکت رک جاتی تھی) تم ایسا انتظام نہیں کرتے تھے جس سے انہیں سامانِ زیست میسر آ جاتے۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹)۔ تم باپ دادا کی میراث خود ہی ہڑپ کر جاتے تھے۔ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰)۔ اور چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ سمٹا کر تمہارے پاس جمع ہو جائے۔

اس کے بعد آپ پھر سورۃ الماعون کی طرف آ جائیے جہاں کہا گیا ہے کہ تکذیب دین وہ کرتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت و تکریم کرنے کی بجائے انہیں دھکے دیتا ہے اور وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۳) معذور لوگوں کی روزی کا انتظام نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہے: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (۱۰۷/۴)۔ یہ وہ مصلین (نمازی) ہیں جن کی نمازیں ان کے لیے تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۵-۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی مرئی اور محسوس حرکات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح اور غرض و غایت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں یعنی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں، جنہیں نوعِ انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے رواں دواں بہتے رہنا چاہیے تھا، ... کے سامنے بند لگا کر انہیں اپنے لیے روک لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مصلین جن کی نماز ان پر تباہیاں لاتی ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

سورۃ المدثر میں ہے کہ جہنم کے دارونغے مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کون سے ایسے جرائم کے مرتکب ہوتے تھے جن سے تم داخلِ جہنم ہو رہے ہو۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۔ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۴/۴۳-۴۶) وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ ہم معذوروں

اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم ان امور کے متعلق باتیں تو بہت بنایا کرتے تھے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا کرتے تھے۔ اور یوں ہم دین کی تکذیب کرتے تھے۔

یہ تو دین کی تکذیب کرنے والے مصلین تھے۔ اس کے مقابلہ میں سورۃ المعارج میں قرآن کریم نے اپنے مخصوص مجازی انداز میں کہا ہے کہ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰/۱۷) جہنم آوازیں دے دے کر بلاتے گی ان لوگوں کو جن کا شیوہ یہ تھا کہ جب انھیں دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بلایا جاتا تو وہ یا تو پیٹھ موڑ کر چل دیتے، اور اگر بات سن لیتے تو گریز کی راہیں نکالتے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰/۱۸)۔ یہ وہ لوگ تھے جو دولت جمع کرتے تھے اور اپنی تھیلیوں کا منہ کس کر بند کر لیتے تھے۔ اس کے بعد کہا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۱۹-۲۱) حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی راہنمائی سے بے نیاز ہو جاتے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ بڑا بے صبرا بن جاتا ہے۔ ایسا بے صبرا کہ ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب خوشحالی آتی ہے تو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد کہا: اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (۷۰/۲۲) لیکن مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ یعنی وہ لوگ جو الصلوٰۃ کی التزاماً پابندی کرتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۰/۲۳-۲۶)

یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے۔ جن کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں یا وہ بالکل معذور ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان آیات میں "حق معلوم" کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ یعنی سائل و محروم، نہ تو ان سے خیرات مانگتے ہیں نہ یہ انہیں بطور خیرات کچھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں جانتے ہیں کہ ان کے مال میں ہر ضرورت مند کا حق ہے۔ وہ اسے بطور استحقاق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی زکوٰۃ اور خیرات کا نہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس کا فریضہ تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت ہے۔ اس نظام میں ہر ضرورت مند کو سامانِ زیست اس کے حق کے طور پر ملتا ہے۔ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے۔ اور یہ اقامت صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ ہے۔

ہم اوپر (سورۃ الماعون میں) دیکھ چکے ہیں کہ تکذیب دین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نماز کی محسوس اور مرئی حرکات (رکوع، سجود وغیرہ) ہی کو الصلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس کی روح، مقصد اور غرض و غایت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

---

حـ ۱ اجتماعات صلوٰۃ تو موقت ہوں گے لیکن صلوٰۃ کا عمل (فرائض خداوندی کی ادائیگی کا سلسلہ) مستقلاً جاری رہے گا۔

سورۂ نساء میں ان لوگوں کو منافقین کہا گیا اور ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے کہ: وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ (۴/۱۴۲) جب وہ الصلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لیے ہوتے کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ان حرکات وسکنات کی ادائیگی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ پورا ہو گیا۔ وہ حرکات وسکنات، جنہیں لوگ دیکھ سکیں اور اس طرح ان کی تعریف کریں کہ یہ بڑے پکے نمازی ہیں۔ اس آیت میں لفظ کسالی میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے۔ روئی دُھننے والے کے پاس دھنک ہوتی ہے جس میں کمان کے ساتھ تانت لگی ہوتی ہے۔ ان دونوں کے یکجا ہونے سے روئی دھننے کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر تانت اور کمان کو الگ الگ کر دیا جائے تو یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ "الکسل" اس تانت کو کہتے ہیں جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ وہ صلوٰۃ جس میں اس کی محسوس حرکات سے اس کے مقصد وغایت کو الگ کر دیا جائے۔ میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہے۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کی یہ کیفیت بتائی گئی ہے: وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹/۵۴)۔ وہ صلوٰۃ کی طرف آتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لیے ہوتے اور اگر دین کی خاطر کچھ دیتے ہیں تو بیگار سمجھے ہوتے!

ان آیات سے یہ حقیقت آپکے سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ اور نظامِ معیشت کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور جب صلوٰۃ سے معاشی نظام کو الگ کر دیا جائے یا جب معاشی نظام کو نظامِ صلوٰۃ سے جدا کر دیا جائے؛ قرآن کریم کی رُو سے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

## صرف حرکات وسکنات صلوٰۃ نہیں

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اگر صلوٰۃ کی غرض وغایت پیشِ نظر نہ ہو اور صرف نماز کی حرکات وسکنات (ارکان) کو صلوٰۃ سمجھ لیا جائے تو قرآن اسے صلوٰۃ تسلیم نہیں کرتا۔ اس فرق کو اس نے سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۱۷۷) میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ نیکی اس کی ہے جو اللہ۔ آخرت۔ ملائکہ۔ کتب اور انبیاء پر ایمان لائے۔ اور اس کے بعد وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ۔ مال کی محبت کے علی الرغم اسے ضرورت مند اقربا۔ یتامی۔ مساکین مسافروں، محتاجوں کو دے۔ اور انہیں دے جو انسانوں کی محکومیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد ہے وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ...... (الآیہ) اور وہ اس طرح

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مفہوم ہے اور ایتائے زکوٰۃ سے کیا مقصود؟ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم ہے ایمان کے بعد اپنی دولت کو ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لیے کھلا رکھنا۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مراد ہے افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔

اور اس کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ آپ صلوٰۃ (نماز) میں کہیں اس کے معنی اور مطلب آپ کو معلوم ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴/۴۳) "اے ایمان والو! جب تم مدہوشی کی حالت میں ہو تو اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہو۔ ان میں اس وقت شریک ہو جب تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو"۔ اس میں ذکر تو بالخصوص حالتِ مدہوشی کا ہے لیکن اصول یہ ہے کہ صلوٰۃ اس طرح ادا کرو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو تمہیں اس کے معانی اور مطلب معلوم ہو۔ جن الفاظ کے معانی معلوم نہ ہوں ان کے دہرانے سے فائدہ کیا ہے؟ (لیکن ہمارے ہاں تو پورے کے پورے قرآن کے الفاظ بلا سوچے سمجھے دہرائے جاتے ہیں۔ صلوٰۃ کا ذکر کیا)۔

بہرحال آیت (۴/۴۳) سے واضح ہے کہ صلوٰۃ سے مقصود ظاہرا ارکان کی ادائیگی ہی نہیں۔ اس کا مقصد محتاجوں اور مسکینوں کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا ہے۔ بالفاظ دیگر صلوٰۃ انسان کو اس ایثار کے لیے آمادہ کر دیتی ہے۔ اگر صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں تو وہ محض میکانکی عمل ہے۔

## نماز

اگرچہ قرآن کریم کی رُو سے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں۔ اور کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صلوٰۃ) اس شکل کے لیے بھی آیا ہے جسے نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے۔ ایران کے مجوسی (جنہیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریقِ پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہندو پاک) میں آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوٰۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ بایں ہمہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، الصلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لیے بھی آیا ہے جنہیں اب نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے: وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۴۲/۳۸)

"یہ وہ لوگ ہیں جو احکامِ خداوندی کے بلاوے پہ لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں امورِ مملکت باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں اور اس پہ غور و فکر کرتے ہیں کہ فریضۂ انفاق کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں۔" صدرِ اوّل کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب مملکت کے کسی اہم معاملہ کے لئے مشاورت کی ضرورت لاحق ہوتی تو حکومت کی طرف سے ان الفاظ میں منادی کرائی جاتی کہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ۔ اس پہ لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جمع ہو جاتے۔ چونکہ مشاورت کی غایت، قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا تھا اس لئے اس کی ابتدا، نماز کی شکل میں ہوتی۔ (جس طرح اب ہمارے ہاں رسمی طور پہ جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآن کریم سے کیا جاتا ہے۔) اس سے ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات وقتِ مقررہ پہ ہوتے تھے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ، اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) یاد رکھو! صلوٰۃ، مومنین کے لئے ایک مؤقت فریضہ ہے۔ یعنی ایسا فریضہ جس کی وقتِ معین پہ ادائیگی کی جائے گی۔ بالفاظِ دیگر جو وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اس وقت اس اجتماع میں شرکت لازمی ہو گی۔

ان اجتماعات کے لئے بھی وہ بلاوا ہے جسے قرآن نے ندائے صلوٰۃ (اذان) سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ جمعہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲/۹) اے افرادِ جماعتِ مومنین! تمہیں یوم الجمعہ کو صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر مقامِ اجتماع کی طرف لپک کر آجایا کرو کیونکہ وہاں "اللہ کی باتیں" ہوں گی۔ دوسری جگہ ہے وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (۵/۵۸) مخالفین کی حالت یہ ہے کہ جب تم الصلوٰۃ جیسے اجتماع کے لئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ صلوٰۃ کے بعد مسجد میں جملہ معاملات طے پاتے تھے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب وصیت کے معاملہ میں کوئی متنازعہ فیہ امر فیصلہ طلب ہو تو صلوٰۃ کے بعد متعلقہ پارٹیوں کو وہاں روک لیا کرو تاکہ اس معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے (۵/۱۰۶)

جس شکل میں نماز پڑھی جاتی ہے اس کی تمام جزئیات قرآن کریم میں نہیں آئیں۔ صرف چند ایک (مثلاً قیام، رکوع، سجدہ) کا اجمالی طور پہ ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ان جزئیات کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ انہیں حضور نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا۔ چشم ما روشن، دلِ ما شاد۔ لیکن اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ یہ ظاہر ہے کہ امت میں کئی فرقے ہیں اور ایک فرقہ کی نماز کی جزئیات اور دوسرے فرقوں کی نماز کی جزئیات میں فرق اور اختلاف ہے۔ یہ اختلاف اس قدر

شدید ہے کہ اس کی بنا پر بحث و مناظرہ ہی نہیں، دنگا فساد تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حتٰکہ پولیس اور عدالت تک۔ اس کے باوجود ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی نماز وہی ہے جو حضور نبی اکرمؐ نے ادا فرمائی تھی۔

حضور نبی اکرمؐ ساری عمر نماز ادا فرماتے رہے۔ تنہا نہیں ، سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ کی موجودگی میں۔ ان سب نے اسی طرح نماز ادا کی جس طرح انہوں نے حضورؐ کو ادا کرتے دیکھا تھا۔ (ایک حدیث بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے دیکھتے ہو)۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نمازوں میں اختلاف کب پیدا ہوا اور کس طرح پیدا ہوا؟ اور پیدا بھی اس طرح ہوا کہ اس کے مٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں! اب متعین طور پر فیصلہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے نماز کس شکل میں ادا فرمائی تھی۔

قرآن کریم نے الصلوٰۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس نے سورۃ روم میں کہا کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم صلوٰۃ قائم کرنا اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا، فرقوں میں بٹ گئے اور پھر کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قرآن کریم نے صلوٰۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے اور وحدت برقرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا اور تفرقہ کو شرک۔

## موجودہ نماز تفرقہ کا مظہر ہے

لیکن وائے بدنصیبی کہ اب وہی صلوٰۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی ہے۔ کسی جلسہ میں دس ہزار مسلمان بیٹھے ہوں ان میں فرقہ بندی کی کوئی مخصوص علامت سامنے نہیں آئے گی، سب ایک امت کے افراد دکھائی دیں گے لیکن اس دوران میں اگر نماز کی اذان سنائی دے تو ان میں سے ایک ٹولی ایک مسجد کا رخ کرے گی دوسری ٹولی دوسری مسجد کا، اور اس طرح ان کے گروہ مندانہ اختلافات ابھر کر سامنے آجائیں گے اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ایک فرقہ سے متعلق مسلمان کو دوسرے فرقہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر وہ بھولے بھٹکے دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے گا تو دہائی مچ جائے گی کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔ اس تفرقہ سے وہ لوگ بچیں گے جو نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جتنی کثرت سے لوگ نماز پڑھیں گے اتنی کثرت سے امت کے اختلافات ابھر کر نمایاں ہو جائیں گے۔ کچھ عرصہ پہلے دفاتر میں

نماز پڑھنے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے برسوں سے دفتر کے اہل کار بلا اختلاف اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ نماز باجماعت کی تحریک شروع ہوئی تو ایک ہی دفتر میں نہیں بلکہ ایک ہی کمرے میں، شیعہ سنی، وہابی، دیوبندی، بریلوی کے گروہ الگ الگ ہو گئے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ (مولانا) نورانی نے صدرِ مملکت سے کہا تھا کہ وہ (اور تو اور) مسجد الحرام میں امامِ کعبہ کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔

قرآن مجید میں صرف ایک مسجد کا ذکر ہے جو تفرقہ کا موجب تھی۔ اسے مسجد ضرار کہہ کر پکارا گیا اور کفر کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ اور خدا اور رسول کے دشمنوں کی آماجگاہ۔ یہ اس لئے کہ وہ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ کا موجب تھی (۹/۱۰۷)۔۔۔۔ رسول اللہ سے کہا گیا کہ آپ اس میں قدم تک نہ رکھیں۔ تاریخ بتاتی ہے اسے آپؐ نے مسمار کرا دیا حالانکہ اس کے بنانے والے قسمیں کھاتے رہے کہ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی (۹/۱۰۷)۔ ہماری نیت بڑی نیک تھی۔ اب ہماری ہر مسجد تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ کا موجب اور مظہر ہے۔

---

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے کہا کہ یہ تمام اختلافات احادیث کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم قرآن سے نماز کی جزئیات متعین کریں گے۔ یعنی اس قرآن سے جس میں یہ جزئیات ہیں نہیں۔

**فرقہ اہلِ قرآن**

اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ اس فرقہ کے بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی تھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کی رُو سے پانچ وقت کی نماز ہے۔ ہر نماز میں دو، تین، چار رکعتیں، اور ہر رکعت میں دو سجدے ہیں۔ ان کے مقتدی لاہوری فرقے نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ قرآن کی رُو سے، تین وقت کی نماز۔ ہر نماز کی دو رکعتیں اور ہر رکعت میں ایک سجدہ ہے اور اسی قسم کے اختلافات اور بھی۔ یعنی قرآن اس اعتراض سے بچا ہوا تھا کہ اس میں اختلافات نہیں۔ انہوں نے اسے بھی نہ چھوڑا۔

اک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا اس کے بھی دل پہ آخر چرکہ لگا کے چھوڑا

ہم نے ان کے اس نظریہ اور مسلک کی شدت سے تردید کی اور "فرقہ اہل قرآن کے گمراہیاں" کے عنوان سے ایک مفصل پمفلٹ میں ان کے دلائل کا ابطال کیا۔ (طرفہ تماشا ملاحظہ ہو کہ ہمارے مولانا صاحبان خود مجھے "اہل قرآن" کہتے ہیں! یا للعجب!!)

سوال ابھرے گا کہ امت میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں، وہ مٹ کس طرح سکتے ہیں؟ ان کا مٹنا اس لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، امت میں اختلاف خدا کا عذاب ہے (۶/۶۵) اور تفرقہ شرک (۳۰/۳۱)۔ خدا نے اس امت کو امتِ واحدہ بنایا تھا۔ اس لئے جب تک اس امت میں اختلافات

تفرقے، فرقے باقی ہیں، یہ امت، امتِ مسلمہ نہیں قرار پا سکتی۔ صرف مسلمان نام رکھنے والی قوم بن سکتی ہے۔ اور جب تک یہ قوم امتِ مسلمہ نہیں بنتی، نہ ان کی مملکت، اسلامی مملکت ہو سکتی ہے، نہ ان کے اعمال و ارکان اسلام کا مقصد پورا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے حقیقی مسلمان نہیں بن جاتے، اسی طرح ارکانِ اسلام (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کی شکلیں قائم رکھنے سے یہ اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتے جس کے لئے انہیں خدا نے متعین کیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی جب کہا تھا کہ:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے

بالفاظِ دیگر:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اسلامی مملکت کا اولین فریضہ امت کے اختلافات مٹانا اور انہیں اسلامی ارکان کے ظواہر کی روح سے آشنا کرانا اور ان کا مقصد بروئے کار لانا ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں دو ایک مغالطوں کا دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہیں پیدا کرکے، پراپیگنڈہ کی مہم تیز کی جاتی ہے۔ میں جب اسلامی مملکت یا اسلامی حکومت کہتا ہوں تو اس سے مراد ہوتی ہے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت۔ یعنی وہی مملکت جیسی عہدِ رسالتمآبؐ اور زمانۂ خلافتِ راشدہ میں قائم ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا جملہ کاروبار کتاب اللہ کے مطابق سرانجام پاتا تھا۔ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی کے لئے میں نے "مرکزِ ملت" کی اصطلاح اختیار کی تھی۔ وہ اتھارٹی (جسے اب سربراہ مملکت کہا جاتا ہے)۔ مرکز (CENTRE) تھی اور امت محیط جس کا ہر نقطہ مرکز سے یکساں فاصلہ پر تھا، اور وہ اس وقت تک قائم تھی جب تک مرکز قائم تھا۔ اسلامی نظام کے لئے (میرے نزدیک) یہ نہایت برجستہ اور نادر تشبیہ تھی۔ قرآن کریم کی روشنی میں اس مرکز کا ہر فیصلہ حرفِ آخر قرار پاتا تھا۔

مغالطہ آفرینی اور افترا پردازی کی رُو سے، میرے خلاف کہا یہ گیا کہ میں پاکستان کی مختلف حکومتوں کے سربراہوں کو "مرکزِ ملت" قرار دیتا ہوں۔ استغفر اللہ۔ جو شخص ان حکومتوں کو اسلامی تسلیم نہیں کرتا، وہ ان کے سربراہوں کو، اسلامی نقطہ نگاہ سے مرکزِ ملت کیسے کہے گا؟ انہیں ملت سے کیا واسطہ اور اسلام

سے کیا تعلق؟

جب میں کہتا ہوں کہ امت کے اختلافات اسلامی نظام، یا اسلامی مملکت مٹائیگی تو اس سے مراد قرآنی مملکت یا نظام ہوتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس انداز کی حکومت یا نظام کو ایک بار پھر قائم ہونا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دین خداوندی (قرآنی نظام) کو تمام ادیان (انسانیت ساز نظاموں) پہ آخرالامر غالب آنا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں غالب آسکے گا کہ اس انداز کی مملکت قائم ہو۔ امت کے اختلافات یہ مملکت دور کر سکے گی۔

امت کے اختلافات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) عقائد میں اختلافات (۲) اور ارکان اسلام (نماز روزہ وغیرہ) کی ادائیگی میں اختلافات۔ عقائد کے اختلاف دور کرنے کا طریق یہ ہوگا کہ انہیں قرآن کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ جو اس کے مطابق ہوں انہیں رکھ لیا جائے جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔

جہاں تک ارکان اسلام کا تعلق ہے، ان کا حکم تو قرآن کریم میں موجود ہے لیکن ان کی جزئیات (بہ تمام وکمال) قرآن میں موجود نہیں۔ (مثلاً صلوٰۃ یعنی مروجہ نماز کو لیجئے) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ جزئیات قرآن میں نہیں اور ان میں ہر فرقہ کا اختلاف ہے۔ اور ہر فرقہ کا دعویٰ کہ اس کی نماز، رسول اللہؐ کی نماز جیسی ہے۔ اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کر دیتا ہے۔ ہر فرقہ ایسا ہی کہتا ہے ان حالات میں، اس نظام کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ حتمی اور یقینی طور پہ طے کر سکے کہ مروجہ فرقوں کی نمازوں میں سے کون سی نماز رسول اللہؐ کی نماز جیسی ہے۔ یہ دقت نماز ہی میں نہیں، باقی ارکانِ اسلام کی جزئیات میں بھی پیش آسکے گی۔

اب صورت یہ پیدا ہوئی کہ

۱۔ ان اختلافات کے مٹائے بغیر امت، امتِ مسلمہ نہیں بن سکتی۔ اور

۲۔ یہ اختلافات، موجودہ ذرائع (احادیث اور فقہ) کی رو سے مٹ نہیں سکتے۔ تو پھر اسلامی نظام کرے گا کیا؟

میری قرآنی بصیرت اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن کریم نے امت، یا اسلامی مملکت کے متعلق جو کہا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے تو یہ ان معاملات کے متعلق ہے جن کا اصولی حکم تو قرآن کریم میں دیا گیا ہے لیکن ان کی جزئیات اس نے خود متعین نہیں کیں۔ ان جزئیات کا تعین اسلامی نظام، امت کے مشورہ سے کرے گا۔ اس کا فیصلہ قولِ فیصل ہوگا جس کا اطلاق ساری امت پہ یکساں ہوگا۔ مجھے

اس کا احساس ہے کہ (اسوۂ سنت) ہر فرقہ اس طریق کی مخالفت کرے گا۔ اس لئے کہ کوئی فرقہ بھی اپنے طریق کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ ان سے یہی کہا جائے گا کہ اس کے سوا کوئی اور طریق ایسا ہو جس سے یہ اختلافات مٹ سکیں، تو آپ اسے تجویز فرما دیجئے۔ ان میں سے ہر فرقہ یہی کہے گا کہ ان کے طریق کو تمام فرقوں پر مسلط کر دیا جائے تو اختلافات مٹ جائیں گے؟ یہ کہتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ ایسا ہر فرقہ کہے گا تو کیا اس سے اختلافات مٹ جائیں گے؟

لیکن جب تک ایسا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت جیسا قرآنی نظام) قائم نہیں ہو جاتا ہر فرقہ اپنے اپنے طریق پر ان ارکان کو ادا کرتا رہے لیکن اس میں اس قسم کی شدت پیدا نہ کی جائے جس سے سر پھٹول تک نوبت پہنچ جائے نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی جائے کہ مروجہ طریقوں میں کسی قسم کا ردوبدل کرے یا (اہل قرآن کی طرح) کوئی نیا طریق وضع اور اختیار کرے۔ اس سے امت میں مزید انتشار پیدا ہو جائیگا میرا یہی مسلک ہے

---

میں نے اوپر کہا ہے کہ اس وقت ارکانِ اسلام کی صرف ظاہرا شکل باقی ہے۔ ان کی روح باقی نہیں جس سے وہ مقاصد حاصل ہونے تھے جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی۔ میرا مسلک یہ ہے کہ جب تک اسلامی مملکت قائم نہیں ہوتی ان ظواہر کو اسی طرح باقی رکھا جائے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ہمارے قومی تشخص کا ذریعہ ہیں جس قسم کے بھی ہم ہیں، ان سے بہر حال ہماری پہچان ہو جاتی ہے، جس طرح ہمارے نام سے، غیر مسلموں سے ہمارا امتیاز ہو جاتا ہے حالانکہ وہ صرف نام ہی ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جب کبھی اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آئے گا ان بے روح پیکروں میں قرآنی روح پھونکنا آسان ہوگا۔ ہمیں نئے سانچے بنانے کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ تو اس میں مندرجہ بالا دونوں مقاصد شامل تھے۔

لیکن ان ظواہر سے متمسک ہوتے ہوئے اگر ہم سمجھ لیں کہ ان کی ادائیگی سے منشاءِ خداوندی پورا ہو جاتا ہے تو یہ بہت بڑی خود فریبی ہوگی۔ ظواہر کی شکلوں کی پابندی یا ارکانِ اسلام پر میکانکی طور پر عمل پیرا ہونے سے ان کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا، اس طرح ایک صف میں کھڑے ہونے کے باوجود محمود، محمود رہتا ہے اور ایاز ایاز۔ حقیقی صلوٰۃ میں نہ محمود محمود رہے گا نہ ایاز، ایاز۔ دونوں خدا کے عبد اور یکساں طور پر تکریم انسانیت کے مستحق ہوں گے۔ صدرِ اول میں امت نے رفعت اور بلندیوں کے جو بے مثال مقامات حاصل کئے تھے تو ان ارکان کے ظواہر کی پابندی سے نہیں ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر کئے تھے۔ اس وقت عمر ابن خطاب، بلالؓ حبشی کو سیدنا بلالؓ کہہ کر سلام کرتا تھا۔ اور چشمِ فلک نے یہ جنت بدوش نظارہ دیکھا تھا کہ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے　　　تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ ہے قرآنی صلوٰۃ جو تکریم انسانیت کا واحد اور منفرد ذریعہ ہے۔